قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چوہترواں سال

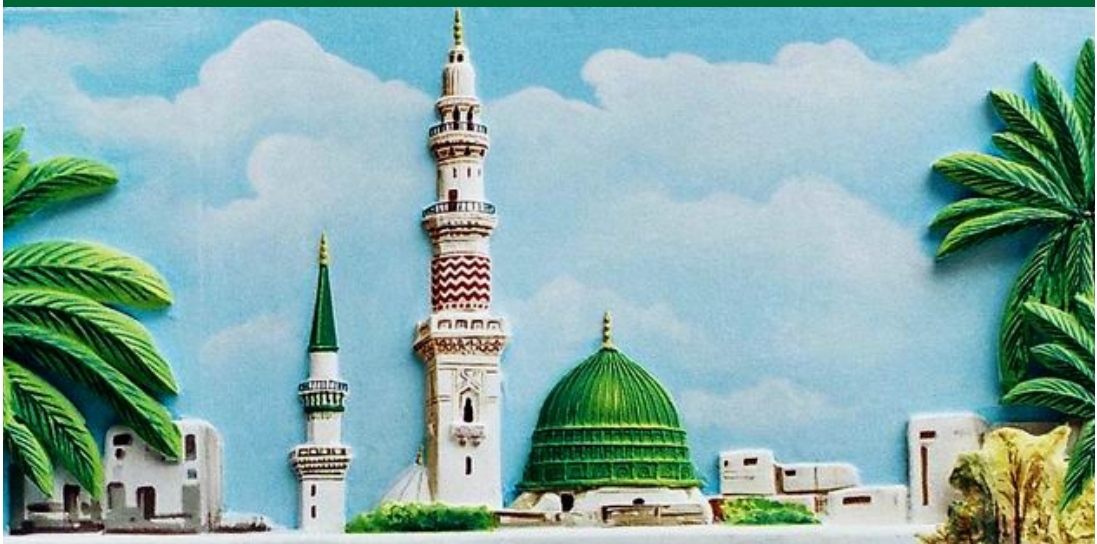
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جنوری 2017ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (21:107)

وہ ضابطۂ قوانین جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وراثتِ ارض حاصل ہوتی ہے، اب، اے رسولؐ! دنیا کو تمہاری وساطت سے دیا جا رہا ہے۔ تم اقوامِ عالم سے کہہ دو کہ ان کی صحیح نشوونما، جس سے انسانی صلاحیتیں بیدار ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں، اسی ضابطہ کی اطاعت سے ہو سکتی ہے۔ جو قوم اس حقیقت سے انکار کرے گی، اس مرحمتِ ایزدی سے محروم رہ جائے گی۔ یوں، تمہاری بعثت تمام اقوامِ عالم کے لئے حقیقی رحمت کا موجب بن جائے گی۔

(مفہوم القرآن، صفحہ نمبر: 748، از غلام احمد پرویزؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

جلد 70 | شمارہ نمبر 01 | جنوری 2017ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت (قسط 15)	منظور حسین لیل	6
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا مفہوم کیا ہے	غلام احمد پرویزؒ	18
مسلمانوں کی خود ساختہ اور خلافِ قرآن شریعت	خواجہ ازہر عباس	38
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	48

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) **Chapter 3: Spring's Message**
(*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) – **Message to Fellow-Ambassadors**
(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959) **(Episode-1)**
By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **56**

زرِ تعاون	50 روپے فی پرچہ
پاکستان	-/550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/800 روپے سالانہ
بیرون ملک	-/2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/5000 روپے سالانہ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

Idara Tolu-e-Islam Bank Account National Bank of Pakistan
Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔54660، (پاکستان) فون: 042-35714546 ، 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

اُمّتِی باعثِ رسوائی پیغمبر ﷺ ہیں

آپ نے یہ دعا ہر اجتماع میں سنی ہوگی کہ:

اللّٰھم اخذل من خزل دین محمد ﷺ

اے اللہ! جو شخص (یا قوم) دین محمد ﷺ کو رسوا کرے، تو اسے ذلیل و رسوا کر دے۔

آپ سوچئے کہ ہم سے زیادہ، دین محمد ﷺ کو رسوا کرنے والا کون ہے۔ اقبالؔ نے تو مدت ہوئی کہا تھا کہ ــــ امتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ﷺ ہیں ــــ لہٰذا، خدا ہماری دعا کو سنتا ہے اور اسے قبول کر لیتا ہے۔ ہم صدیوں سے یہ دعا مانگتے چلے آ رہے ہیں اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ (3:160) اگر وہ تمہیں ذلیل و رسوا کر دے تو دنیا میں کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے!

لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ اس دعا کے بعد ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ فلا تجعلنا منھم۔ ہمارا شمار ان میں نہ کیجئے یعنی اور لوگ اگر دین محمد ﷺ کو رسوا کریں تو انہیں تو ضرور ذلیل و رسوا کیجئے لیکن ہمارے ساتھ یہ کچھ نہ کیجئے۔ کیوں صاحب! ہمارے ساتھ یہ کچھ کیوں نہ ہو! کیا ہم (یہودیوں کے زعمِ باطل کے مطابق) خدا کی چہیتی اولاد ہیں۔ خدا کی کوئی چہیتی اولاد نہیں۔ اس کے قانونِ مکافات میں کسی کی تخصیص نہیں ہوتی۔

آپ کسی کے سامنے اسلام کے اصول پیش کیجئے۔ وہ ان کی حقانیت کو تسلیم کرے گا لیکن اس کے بعد وہ کہے گا کہ اگر اس تعلیم کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اپنے ماننے والوں کو ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں عطا کرتا ہے، تو پھر مسلمان دنیا میں ذلیل و خوار کیوں ہیں ــــ اور اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اور وہ منہ پھیر کر چل دے گا ــــ یہ ہماری زبوں حالی ہے جو دنیا کو اسلام کی طرف آنے نہیں دیتی۔ اسلام کے راستے میں ہم حائل ہیں۔ اگر ہم اسلام کے نام لیواؤں کی حیثیت سے دنیا کے سامنے نہ ہوں اور اقوامِ عالم، اس کے اصولوں کو (ON MERIT) پرکھیں تو وہ آج اسلام قبول کر لیں، یا کم از کم اسے حقارت کی نگاہوں سے کبھی نہ دیکھیں۔ یوں ہم اسلام کی رسوائی کا موجب بنتے ہیں اور ہماری یہ دعائیں قبول ہوتی ہیں کہ:

بارالٰہا! جو تیرے دین کو رسوا کرے، تو اسے رسوا کر دے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ الصفٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	----	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	28 واں پارہ (مکمل)	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم			
سورۃ النور	(24)	264	350/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوعِ اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ زرِ شرکت

سالانہ زرِ شرکت اندرونِ ملک -/550 روپے، بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک -/800 روپے

بیرونِ ملک -/2500 روپے، بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک -/5000 روپے

Bank Account Idara Tolu-e-Islam (National Bank of Pakistan Main Market, Gulberg Lahore)

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط نمبر 15

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (5:44-45-47)

نظامِ عدل

قرآنی نظامِ عدل:

قرآنی نظامِ عدل میں، انسانی پہلو کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس نظام کا مقصد فرد اور معاشرہ کی اصلاح ہے۔ اس لئے قوانینِ خداوندی میں بھی اسی پہلو کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اور ان قوانین کے اطلاق میں بھی اسی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یعنی اس میں جج صاحبان کا فریضہ یہ نہیں ہوتا کہ ان قوانین کو مشین کی طرح نافذ کر دیا جائے۔ ان کا فریضہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ قانون کی مذکورہ بالا غرض و غایت کس طرح پوری ہوتی ہے۔ یعنی قانون اس غرض و غایت کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔'' اس کے بعد پرویز صاحب نے قرآنی مثالوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ قرآن کے مطابق قانون سازی کے سلسلہ میں انسانی پہلوؤں کی کس قدر رعایت رکھی گئی ہے، اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ قرآن کے تعزیراتی قوانین کے اطلاق میں اس پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کتاب ''قرآنی قوانین'' کا مطالعہ ججوں، وکلاء اور اسلامی قانون سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید رہے گا۔ جولائی 1981ء کے طلوعِ اسلام (ص:17) میں ''قرآنی قوانین'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں انسانی پہلوؤں کی کس قدر رعایت رکھی گئی ہے اور قرآن کے تعزیری قوانین کے اطلاق میں اس پر کس قدر زور دیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

1۔ تاریخِ اجراء سے پہلے:

''قرآن کا پہلا اصول یہ ہے کہ قانون کا اطلاق اس کی تاریخِ اجراء سے ہوگا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا، ہو چکا۔ اس پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی۔ اس نے جہاں بھی کسی نئے قانون کا تعین کیا ہے، ساتھ ہی کہہ دیا ہے: فَلَهٗ مَا سَلَفَ ط (2:275،8:38،4:23)۔ ''پہلے جو ہو چکا، ہو چکا۔'' سوچئے کہ اس سے افرادِ معاشرہ کو کس قدر اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

2۔ قانون سے عدمِ واقفیت:

سیکولر قانون یہ ہے کہ قانون سے ناواقفیت، اس کی خلاف ورزی کی وجہ جواز نہیں ہوسکتی۔ مجرم قانون سے واقف ہو یا نہ ہو، اسے بہرحال سزا مل کر رہے گی۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو خلاف ورزی قانون سے ناواقفیت کی بناء پر سرزد ہو، وہ قابلِ معافی ہے۔ افرادِ معاشرہ کو قانون سے آگاہ کرنا، حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اگر حکومت اپنی اس ذمہ داری کے پورا کرنے میں قاصر رہتی ہے تو اس کی سزا افرادِ معاشرہ کو کیوں ملے؟۔ (16:119، 6:54)۔

3۔ ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو:

اگلا اصول یہ ہے کہ ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو۔ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ط (2:225، 33:5)۔ اس سے دیکھئے کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے والے جج پر کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟۔ وہ کسی مشین کی نقل و حرکت کا فیصلہ نہیں کر رہا، انسانوں کے عمل و اقدام کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے لئے احوال و کوائف اور نفسیاتِ انسانی کی جن گہرائیوں تک جانے کی ضرورت ہوگی، وہ ظاہر ہے۔ (یعنی نیت۔ Intention۔ کا اندازہ کرنا ہوگا۔ مئولف)

4۔ اضطراری حالت:

قرآن کریم نے جہاں کھانے پینے کی چند ایک چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، وہاں ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط۔۔۔ (2:173)۔ یعنی اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے کے لئے اور کچھ نہ ملے اور تم (جان بچانے کے لئے) مجبور ہو جاؤ، تو ایسی حالت میں ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی اور یا ہوس پروری کی نہ ہو۔۔۔ قرآن کریم نے یہ استثناء بہ نصِ صریح کھانے پینے کی چیزوں کے ضمن میں روا رکھی ہے لیکن بعض دیگر حالات میں بھی اضطراری حالت پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً حفاظتِ خود اختیاری کے لئے کسی کو قتل کر دینا۔ جج صاحبان کے لئے یہ متعین کرنا بھی ضروری ہوگا کہ ایسا عمل اضطراراً کیا گیا ہے۔ اس کے لئے بھی گہرے غور و تدبر اور انسانی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔۔۔ واضح رہے کہ یہ اضطراری گنجائش ہر تقاضے کے لئے نہیں ہے۔ مثلاً اس نے بھوک پیاس کی صورت میں تو اضطرار کو تسلیم کیا ہے۔۔۔ جنسی تقاضوں میں اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کے برعکس، اس نے کہا ہے کہ اگر جائز طریق سے جنسی تقاضے کی تسکین کی صورت نہ ہو، تو ضبطِ نفس سے کام لیا جائے (24:33)۔ لہٰذا، اضطرار کوئی ایسی گنجائش نہیں کہ جہاں جی چاہے اس سے فائدہ اٹھا لیا جائے اور اس طرح ہر ناجائز کام کو جائز قرار دے دیا جائے۔ فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو اس باب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔

تعزیرات:

اب آیئے تعزیرات کی طرف، اس نے کہا ہے کہ جس شخص کے خلاف کسی جرم کے ارتکاب کا الزام عائد کیا جائے، اُس کے خلاف پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ ہوسکتا ہے یہ الزام جھوٹا ہو۔ یعنی پہلا ردِ عمل اسے مجرم تصور کرنے کا نہیں، بلکہ محض ملزم

تصور کرنے کا ہونا چاہیئے۔ سورہء النور میں، جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے عام طور پر واقعہء ''افک'' کہا جاتا ہے (اور جہالت یا سازش کے تحت، حضرت عائشہؓ کو اس میں ملوث قرار دیا جاتا ہے) وہاں دوبار سختی سے کہہ دیا کہ جب فتنہ پردازوں نے اس فتنہ کو ہوا دی تھی تو تمہیں بلا ساختہ کہہ دینا چاہیئے تھا کہ: هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (24:12) هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (24:16) ''یہ محض تہمت تراشی ہے۔ یہ بہتان ہے۔''

ملزم نہ کہ مجرم:

آپ غور کیجئے کہ اس سے ملزم اور معاشرہ پر کیسا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں کے سیکولر نظام میں، جو کچھ ''ملزموں'' کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی جنہیں محض شبہ کی بناء پر شاملِ تفتیش کر لیا جاتا ہے اور آگے چل کر ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ بے گناہ ہیں) کہ اکثر اوقات وہ اس اذیت سے بچنے کے لئے یا تو جھوٹا اقبالِ جرم کر لیتے ہیں اور یا (بعض اوقات) خودکُشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔۔ معاشرہ، انتظامیہ اور عدالت کی طرف سے اس ردِعمل (یعنی ملزم کو بے گناہ سمجھنے) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملزم کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں لگتی۔ قرآنی نظام کی غایت، احترامِ آدمیت کا برقرار رکھنا ہے۔ ملزم تو ایک طرف، وہ مجرم کو بھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا! بلکہ اس کی لغزش پر اس سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔ مجرموں کی تباہی پر، خود خدا بے ساختہ پکارتا ہے کہ: يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (36:30)۔ ''او میرے بندو! کس قدر تاسف انگیز اور حسرتناک ہے تمہاری یہ حالت!'' وہ جرم سے نفرت کی تلقین کرتا ہے، مجرم سے نہیں۔ اور ان دونوں میں فرق کرنا عمیق بصیرت چاہتا ہے۔ قرآنی نظامِ عدل کا یہی تقاضا ہے۔۔ بعض جرائم ایسے شنیع ہوتے ہیں کہ ان سے مستغیث کے دل میں غصے کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ قرآن کریم مومنین کی صفات میں یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ ایسی حالت میں بھی عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں (42:37)۔ حضرت عمرؓ نے اسی بناء پر کہا تھا کہ کسی کا صحیح کردار معلوم کرنا ہو تو اسے غصے کی حالت میں پرکھنا چاہیئے۔

معافی:

اب ہمارے سامنے وہ مقام آتا ہے جہاں قرآنی نظام، دنیا کے ہر نظامِ عدل سے منفرد نظر آتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآنی نظامِ عدل کی غایت افراد اور معاشرہ کی اصلاح ہے۔ وہ اسے ترجیح دیتا ہے کہ یہ مقصد بغیر سزا کے حاصل ہو جائے۔ اور سزا وہیں دیتا ہے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ اثباتِ جرم کے بعد معاف کر دینے کو عام طور پر ''رحم'' (Mercy) کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ ''عدل'' اور ''رحم'' متضاد عناصر ہیں، اس لئے ''رحم'' کو نظامِ عدل کا جزو نہیں قرار دیا جاتا۔ اسے ''ترحمِ خسروانہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں آگے چل کر اس کی وضاحت کروں گا کہ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ قرآن میں اس قسم کے ''رحم'' کا تصور نہیں۔ سردست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآنی نظامِ عدل میں سزا اور معافی دونوں کو ہمکنار رکھا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (5:98، 40:3) ''اسے اچھی طرح سمجھ رکھو! کہ خدا مجرموں کا مواخذہ کرنے میں بڑا سخت گیر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی معاف کر دینے میں بھی بڑا وسیع

الظرف ہے۔''۔۔آگے بڑھنے سے پہلے دو ایک اہم نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(1) قرآن کریم نے خدا کی جن صفات کا ذکر کیا ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ مومنین میں (علیٰ حدِ بشریت) ان صفات کا منعکس ہونا ضروری ہے۔ اور اس کی محسوس اور مرئی شکل یہ ہے کہ ان کا نظام، ان صفات کا مظہر ہو۔ یعنی اس نے جب کہا ہے کہ خدا شدید العقاب بھی ہے اور غفور، رحیم بھی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام کو ان ہر دو خصائص کا حامل ہونا چاہیئے۔ یعنی مجرمین کی گرفت کرنے والا بھی اور معاف کر دینے والا بھی۔ (2)۔ چونکہ ہمارے مروجہ اسلام کے تصورات اور مسالک دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں، اس لئے اس معاشرہ میں، صفاتِ خداوندی کے انعکاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ استبدادِ ملوکیت کے حامل معاشرہ میں ''خدا'' کا کیا کام؟۔

مغفرت کے معنی:

اس سے، سوال یہ پیدا ہوا کہ قرآن میں جو صفاتِ خداوندی کا اس قدر ذکر ہے تو اس کا مطلب اور مقصد کیا ہے؟۔ انہوں نے کہا کہ ان صفات کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ خدا کافروں کو جہنم رسید کرے گا اور مسلمانوں کے گناہ بخش کر انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ ''بخش دینے'' کی اصطلاح قابلِ غور ہے۔ کیونکہ اس کے گرد ہمارے تصورِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت گردش کرتی ہے۔ ''بخشیش'' کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔ یعنی جو چیز بطور استحقاق (As of right) نہ ملے۔ بطور خیرات ملے۔ اس سے خدا کے بخش دینے کا تصور قائم ہوا۔ یعنی اعمال کے لحاظ سے تو ہم جہنم کے مستوجب ہوں گے لیکن خدا ہمارے گناہ ''بخش دے گا۔'' اور اس طرح ہمیں جنت بطور خیرات مل جائے گی۔ اقبال کے الفاظ میں:

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است — بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است
بگو ہندی مسلماں راکہ خوش باش — بہشتے ''فی سبیل اللہ'' ہم است

مفہوم: جنت اچھے کردار والوں کے لئے ہے جو عالی افکار اور بڑی ہمت والے ہُوں۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں سے کہو خوش رہیں کہ بہشت ''فی سبیل اللہ'' یعنی ''اللہ کے نام پر'' بخشش کے طور پر بھی مل جاتی ہے۔ (س۔ا)

اور یہیں سے ''مغفرت'' کا ترجمہ ''بخشش'' اور ''غفور'' کا ترجمہ ''بخشنے والا'' کر دیا گیا۔۔۔ تاریخ کے اولیں دور سے آج تک، بادشاہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اختیارات اور اقتدارات خداوندی کا حامل سمجھا اور منوایا ہے۔ ہندوؤں کے راجہ، ایشور کے اوتار تھے۔ عیسائیوں کے شاہنشاہ حقوقِ خداوندی (Divine Rights) کے علمبردار۔ مسلمانوں کے سلاطین، ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ)۔ ان اختیارات کی رو سے، مملکت کی ہر شے، بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی۔ اور رعایا کو جو کچھ ملتا تھا، اس کی طرف سے ''بخشیش'' کے طور پر ملتا تھا۔ انسان کی سب سے قیمتی متاع، اس کی جان ہوتی ہے۔ سلاطین کے اس منصب کی رو سے، افراد کی جان بھی، ان کی مِلک ہوتی تھی اور افراد کے پاس ان کی طرف سے بخشیدہ۔

ترحمِ خسروانہ:

قرآن میں بیان کردہ داستانِ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں، جب انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ میرا خداوہ ہے جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی ہے، تو اُس نے کہا تھا کہ: اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ۔۔(2:258)۔ ''نہیں افراد کی موت اور حیات میرے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ وہ جسے چاہتا۔۔۔موت کی سزا دے دیتا۔'' پھر مجرم اس کے حضور، روتا، چیختا۔ گڑگڑاتا۔ نہ صرف ہاتھ جوڑتا بلکہ سجدے بھی کرتا اور انتہائی عجز و لجاجت سے کہتا۔۔ کہ حضور! میری جان بخشی کر دیجئے۔ اور اس کا ایک اشارہء ابرو اس کی ''جان بخش دیتا۔'' اس سے درحقیقت تذلیلِ انسانیت مقصود تھی۔ بادشاہ اپنے مخالفین کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ حقوق ہر دور کے شاہنشاہوں نے اپنے لئے مخصوص رکھے۔

رحم کی اپیل:

حتیٰ کہ آج کی مہذب دنیا میں بھی، جہاں دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ملوکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے، تمام دنیا کے دساتیر (Constitutions) میں سزائے موت پانے والے مجرموں کی ''رحم کی درخواست'' منظور یا مسترد کرنے کا اختیار سربراہِ مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہی نمرود کے تمرد کی صدائے بازگشت ہے، وہی روحِ ملوکیت ہے جو آئینی پردوں میں رقصاں ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس ''ترحمِ خسروانہ'' سے جان تو بخشیش میں مل جاتی ہے لیکن انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر قلبِ حساس کر سکتا ہے۔۔۔ ایک انسان کا اپنے جیسے انسان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونا اور منتیں کرنا کہ حضور! میری جان بخشی کر دیجئے، اس سے بڑھ کر ایک طرف کبر و تمرد اور دوسری طرف تذلیلِ انسانیت اور کیا ہوگی!۔ چنانچہ ہمیں تاریخ میں ایسے غیور ''مجرموں'' کے نام جلی حروف میں لکھے ملتے ہیں جنہوں نے جلاد کی تلوار یا پھانسی کے تختے کو قبول کر لیا لیکن اپنے ہی جیسے انسان (سربراہِ مملکت) سے جان کی بھیک مانگنا گوارا نہ کیا۔۔۔ قرآن کریم نے تذلیلِ انسانیت کی اس رسمِ کہن کا خاتمہ کر دیا اور سزا سے معافی کو، کسی حاکمِ اعلیٰ کی خیرات کی جگہ، خود قانونِ تعزیرات کا جزو بنا دیا۔

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ:

یہ بہت بڑا انقلاب تھا۔ جس سے قرآن نے دنیائے انسانیت کو آشنا کرایا۔ آپ کو قرآن کریم میں ہر جرم کی سزا کے بعد ''وَاَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ'' لکھا ملے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی، شدید العقاب (سخت مواخذہ) اور غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (معافی) دونوں سے مرکب ہیں۔ واضح رہے کہ ''مغفرت'' کے معنی ''بخشش'' نہیں۔ اس کے معنی ''حفاظت'' ہیں۔ اور ''غفور'' کے معنی ''بخشنے والا'' نہیں، بلکہ ''حفاظت کرنے والا'' ہیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کی خلاف ورزی سے معاشرہ میں کچھ نقصان ہوتا ہے، اور خود مجرم کی ذات کا زیاں بھی۔ قرآنی قانون میں، اس نقصان کی تلافی کی گنجائش

(Provision) رکھ دی گئی اور اس طرح معاشرہ اور اس فرد کو جو نقصان پہنچا تھا، اس کی حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیا۔۔۔ ''رحیم'' کے معنی ''رحم کرنے والا'' نہیں۔ اس کے معنی ہیں، سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ خدا کے غفور' رحیم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ۔ ارتکابِ جرم سے مجرم کی ذات کا جو نقصان ہوا ہے اسے اس سے بھی محفوظ رکھا جائے اور اس کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے میں جو کمی رہ گئی تھی (اور جس کی وجہ سے اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہوا تھا) اسے بھی دور کر دیا جائے۔ یہ ہے قرآن کی رو سے معافی سے مراد۔ جس کی گنجائش ہر جرم کی سزا کے قانون میں موجود ہے۔ ''قانون کے اندر موجود'' ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ معافی کسی انسان کی طرف سے، خیرات یا بھیک کے طور پر نہیں ملتی۔ مجرم اسے قانونی استحقاق (Legal Right) کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اس کی عزتِ نفس بھی مجروح نہیں ہوتی۔

معافی کی شرائط:

لیکن یہ معافی یونہی نہیں مل جاتی۔ یہ ایک اہم شرط سے مشروط ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ: فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (5:39)۔ ''جو مجرم، ارتکابِ جرم کے بعد اپنے کئے پر دل سے نادم ہو اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کرے (اور مجاز اتھارٹی اس کا اطمینان کر لے کہ اس میں اصلاح کا واقعی امکان ہے) تو اسے ''مغفرت اور رحمت'' کے ''حق'' سے نوازا جا سکتا ہے۔ سزا کا مستوجب وہ ہوگا جو جانتے بوجھتے جرم کا ارتکاب کرے اور اپنے جرم پر نادم ہونے کی بجائے، اس پر اصرار کرے۔ چنانچہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ معافی کا حقدار وہ ہے: وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (3:135)۔ ''اسے خلاف ورزیء قانون کے نقصانات کا علم و احساس ہو۔۔۔ اور اس پر اصرار نہ کرے۔'' اس سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن میں جن سزاؤں کا ذکر ہے وہ آخری درجہ پر ''عادی مجرموں'' کے لئے ہیں۔ یعنی جو بار بار ارتکابِ جرم کریں۔۔۔ ان تصریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ اسلامی نظام میں عدالت کی ذمہ داریاں کس قدر گراں بار ہیں۔ اُسے مشینوں کی طرح قانون کے الفاظ کی پیروی نہیں کرنی ہوتی۔ اسے بہت سے نرم و نازک انسانی گوشوں کا لحاظ بھی رکھنا، اور قانون کے بہت سے مستور تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔۔ اب آیئے قرآنی قوانین کو دیکھئے!۔ ان میں سزا اور عفو دونوں یکجا موجود ہیں۔ یعنی سزا سے معافی نہ تو کسی خارجی اتھارٹی کی طرف سے ملتی ہے اور نہ ہی وہ مجرم کو ''رحم'' کے طور پر عطا ہوتی ہے۔ یہ خود قانون کا جزو ہوتی ہے۔ اور جو مجرم ان شرائط کو پورا کرتا ہے (یعنی تاب و اصلح کی شرائط کو) وہ از روئے قانون اس کا حقدار ہو جاتا ہے۔ اس باب میں ہم معمولی لغزشوں سے شروع کر کے سنگین جرائم تک پہنچیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کی رو سے کوئی بھی جرم ایسا نہیں جس میں معافی کی گنجائش نہ ہو۔ یعنی جس میں ارتکابِ جرم کے بعد خدا کے ''غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'' ہونے کا ذکر نہ ہو۔

معافی قانون کی رو سے

1۔ عام اصول:

سورہ ءالنساء میں ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (4:110)۔ ''جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جس کا تخریبی اثر معاشرہ پر پڑتا ہو، یا خود اس کی اپنی ذات پر، اور پھر وہ اس کے لئے خدا سے حفاظت طلب کرے، تو اس نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی اور اس کی ذات کی نشوونما کا سامان بھی مہیا ہو جائے گا۔'' اس اصولی تذکرہ میں ہر قسم کا جرم آجاتا ہے۔ خواہ وہ معاشرہ کے خلاف ہو یا انسان کی اپنی ذات کے خلاف۔۔۔ سورہ ءنمل میں قصہ ءحضرت موسیٰ کے ضمن میں فرمایا کہ اس شخص کو ڈرنے کی ضرورت نہیں: اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (27:11)۔ ''جو کوئی زیادتی کر بیٹھے لیکن اس کے بعد، حسن کارانہ انداز سے (قانون اور قاعدے کے مطابق) اس کا ازالہ کرے، تو وہ خدا کی طرف سے مغفرت اور رحمت سے نوازا جائے گا۔'' سورہ ءاعراف میں ہے: وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (7:153)۔ ''جن لوگوں سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے لیکن اس کے بعد وہ اس سے تائب ہو جائیں اور قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین کر لیں، تو وہ خدا کو غفور و رحیم پائیں گے۔'' اس آیہ ءجلیلہ میں ''تابوا'' کے بعد ''آمنوا'' بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو اُس وقت درحقیقت، اس قانون کی محکمیت اور مکافاتِ عمل پر اس کا ایمان نہیں ہوتا۔ اگر اسے اس کا یقین ہو تو اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہی نہ ہو۔۔۔ معاشرہ سے جرائم کے انسداد، یا کم از کم اصلاح کے لئے یہ بڑا موثر طریق ہے۔ یعنی افرادِ معاشرہ کے دل میں قانون کے احترام اور اس کی خلاف ورزی کے نقصانات پر علیٰ وجہ البصیرت یقین (ایمان) کو پختہ سے پختہ تر کیا جائے۔ اور یہ عمل مسلسل اور متواتر جاری رہے۔ یہ مقصد قانون کی پابندی کے خوشگوار نتائج کو محسوس شکل میں سامنے لانے سے حاصل ہوگا۔ سورہ ءاحزاب میں اس اصولِ مغفرت (معافی) کو ہمہ گیر بتایا گیا ہے، فرمایا: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (39:53) ''(اے رسول!) میرے ان بندوں سے، جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، کہہ دے کہ وہ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمام لغزشوں کے نقصانات کی تلافی کا انتظام کر دے گا۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔'' اس کا طریق یہ ہے کہ: وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (39:54)۔ ''وہ فوراً قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کریں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، قبل اس کے کہ سزا ان پر وارد ہو جائے۔ اس صورت میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔'' خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ: وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۙ (39:55)۔ ''جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے (یعنی قرآن کریم) اس کا بطریقِ احسن اتباع کرو، قبل اس کے کہ تم اپنے دل میں مطمئن ہو رہو کہ مجھ سے کون

مواخذہ کر سکتا ہے، اور خدا کا قانون تمہاری گرفت کر لے۔''۔(ضمناً) آیت (39:53) میں ''اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ۔۔۔'' کہا گیا ہے۔ یعنی مجرم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے دوسرے شخص کو نقصان پہنچایا ہے، حالانکہ اس ارتکابِ جرم سے خود اس کی ذات کو نقصان پہنچا ہے۔ فریقِ مقابل کو تو کوئی طبیعی نقصان پہنچا ہوگا، اس سے خود اس کی ذات کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا، یہ جرم کسی اور کے خلاف نہیں، خود اس کے اپنے خلاف سرزد ہوا ہے۔ سورہ النساء میں ہے: وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۔۔(4:111)۔ ''جو شخص بھی کوئی جرم کرتا ہے، تو وہ جرم کسی دوسرے کے خلاف نہیں، خود اس کے اپنے خلاف ہوتا ہے۔'' اس حقیقت کو اگر افرادِ معاشرہ کے دل میں جاگزیں کر دیا جائے، تو معاشرہ سے جرائم معدوم ہو جائیں۔ اسلام کے صدرِ اوّل کے متعلق جو حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ اس میں جرائم معدوم ہو گئے تھے تو اس کی وجہ انتظامیہ (پولیس وغیرہ) کی حسنِ کارکردگی نہیں تھی۔ اس کی وجہ، افرادِ معاشرہ کی صحیح تعلیم و تربیت سے ان کی ذہنیت کی تبدیلی تھی۔ قانون کی صداقت پر ان کا یقین محکم تھا۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، معاشرہ میں اصلاح ہو ہی نہیں سکتی (13:11)۔ ڈنڈے کے زور سے، جرائم کا انسداد تو ہو نہیں سکتا۔ اس سے البتہ، انسان، حیوانوں کی سطح پر آ جاتے ہیں۔

توبہ کا مفہوم

توبہ بلا تاخیر:

سورۃ الزمر کی آیات (39:54-55) میں جو کہا گیا ہے کہ توبہ، سزا سے پہلے ہونی چاہیئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے بعد، خود مجرم کے خلاف دل میں جذباتِ نفرت کا بیدار ہونا، اس سے مجرم کا منفعل ہونا اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کر لینا، اس کا نام توبہ ہے۔ سزا کی عقوبت سے بچنے کے لئے توبہ کو آڑ بنا لینا، توبہ نہیں۔ توبہ کے لئے دل کی تبدیلی لازمی شرط ہے۔ اس کا احساس ارتکابِ جرم کے فوری بعد ہونا چاہیئے۔ سورۃ النساء میں ہے: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (4:17)۔ ''توبہ اُن کی قابلِ قبول ہوگی جن سے محض نادانی (جہالت) سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اور وہ اس سے بلا تاخیر تائب ہو جائیں۔ یہ ہے خدا کا وہ قانون جو علم اور حکمت پر مبنی ہے۔'' ان کے برعکس: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (4:18)۔ ''ان کی توبہ، توبہ کہلا ہی نہیں سکتی جو ارتکابِ جرم کرتے رہیں اور جب موت سامنے آ کھڑی ہو تو کہہ دیں ''یا اللہ! میری توبہ۔'' نہ ہی ان کی جو حالتِ کفر ہی میں وفات پا جائیں۔ یہ الم انگیز عذاب کے مستوجب ہوں گے۔'' یہاں یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ آیت (7:153) میں سچی توبہ کو ''تجدیدِ ایمان'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جرم پر اصرار کو کفر سے۔'' توبہ کے مفہوم کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام دسمبر 1983ء، ص:41 (مقالہ بعنوان ''مومن کی زندگی'') میں پرویز صاحب رقمطراز

ہیں: ''ایک شخص کا عام کردار اچھا ہے۔ لیکن کسی وقت اس سے نادانستہ کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے اس کا احساس ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے۔ اگر اس کی اس غلط حرکت سے کسی کو اذیت یا نقصان پہنچا ہے تو اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے اس کی پوری پوری احتیاط برتتا ہے کہ کبھی اس قسم کی حرکت سرزد نہ ہو۔ اسے قرآن نے ''تاب واصلح'' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس مقام سے نادانستہ غلط قدم اٹھا تھا، اس مقام پر واپس آجانا اور اس کے بعد اپنی ایسی اصلاح کرنا کہ پھر ایسی غلطی نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرکت نادانستہ، غلطی، سہو اور خطا سے سرزد ہوئی ہو۔ عمداً ایسا نہ کیا ہو۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ط (4:17)۔ ''توبہ اسی کی ہے جس سے کوئی غلطی نادانستہ سرزد ہو جائے۔ اور اس کے بعد، وہ فوراً اس کی تلافی کر دے۔'' اس میں نادانستہ (بجہالۃ) اور فوراً (من قریب) کے الفاظ غور طلب ہیں۔ یہی چیز قرآن کریم نے دیگر مقامات پر بھی بیان کی ہے۔ مثلاً۔ (16:119) میں۔''

عمداً جرائم:

اس کے برعکس، ایک شخص دیدہ دانستہ، عمداً، ارادۃً۔ غلط حرکات کا ارتکاب کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے دوسروں کے خلاف جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ غیبت کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور جب وہ کہیں گھر جاتا ہے۔ اپنی مدافعت کی کوئی شکل نہیں دیکھتا، تو کہہ دیتا ہے کہ مجھے معاف کر دو۔ تو اس کا نام توبہ نہیں۔ اس کے دیدہ دانستہ ارتکاب نے یہ واضح کر دیا کہ یہ چیزیں اس کے کردار کا جزو بن چکی ہیں۔ یونہی نادانستہ سرزد نہیں ہوئیں۔ اس لئے جب تک وہ اپنے کردار میں تبدیلی نہیں پیدا کرے گا، ان باتوں سے باز نہیں آسکے گا۔ وہ توبہ کرنے اور معافی مانگنے کے بعد بھی ایسا کچھ کرتا رہے گا۔ اسی لئے قرآن نے وضاحت سے کہہ دیا کہ: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْٰٔنَ (4:18)۔ ''توبہ ان لوگوں کی نہیں ہے جو بری حرکات کرتے رہتے ہیں تا آنکہ جب ان کے سامنے موت آ کھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میں توبہ کرتا ہوں۔'' ۔۔۔ ''موت کے سامنے آجانے'' سے مفہوم یہ ہے کہ جب اسے اس کا یقین ہو جائے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ بے نقاب ہو جائے گا اور وہ اس کے مواخذہ سے بچ نہیں سکتا تو پھر معافی مانگنے لگ جائے۔ یہ منافقت ہے اور بدترین کردار کی علامت۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرعون ڈوبنے لگا اور اس نے کہا کہ میں خدا پر ایمان لاتا ہوں تو اس سے کہا گیا کہ اب ایمان سے کیا فائدہ؟۔ یہ بھی واضح ہے کہ ایسے شخص نے اپنی اس قسم کی حرکات سے جس شخص کو اذیت یا نقصان پہنچایا ہے، اگر وہ اسے معاف بھی کر دے تو اس سے اتنا ہی ہوگا کہ اُس سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن اُس کی اصلاح تو اُسی صورت میں ہو سکے گی جب وہ اپنے کردار میں خود تبدیلی پیدا کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے مغربی مفکر، نیٹشے نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: ''جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن جو برائی تم نے خود اپنی ذات کے خلاف کی ہے، اسے کون معاف کر سکتا ہے؟'' ۔۔۔ اس اصولی وضاحت کے بعد، پرویز صاحب نے اپنے اس مقالے

میں قرآن کریم کے بیان کردہ جرائم پر تفصیل سے لکھا ہے جسے ان کی کتاب ''قرآنی قوانین'' اور ''تبویب القرآن'' کے علاوہ بہت سی دیگر تصانیف میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

عدل کے علمبردار:

طلوعِ اسلام دسمبر 1983ء، ص:44: ''قرآن کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ: قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ (3:18) ہوتے ہیں یعنی ہمیشہ انصاف پر ڈٹ کر کھڑے رہنے والے۔ عدل و انصاف وہ بنیاد ہے، جس پر انسانی سیرت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم اس باب میں مومنین کے سامنے ایسا بلند معیار رکھتا ہے جس پر پورا اترنے سے معاشرہ فی الواقعہ جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ۔ اے ایمان والو! دنیا میں عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو۔ اس باب میں کسی جذبے کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دو۔ یہ کچھ خالصۃً للہ کرو۔ اس مقصد کے لئے شہادت دینا پڑے تو نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ بلکہ۔ شہداء للہ۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ۔ اور سچی سچی گواہی دو۔ وَلَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ ۔ خواہ وہ تمہارے اپنے ہی خلاف کیوں نہ جائے۔ اولوالدین۔ یا تمہارے والدین کے خلاف جائے۔ والاقربین۔ یا تمہارے دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔۔ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا وہ دولت مند ہو یا غریب ہو، اس کا بھی تم پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس لئے کہ: فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫۔ اللہ کا حق ان دونوں سے زیادہ ہے۔ اس لئے یاد رکھو! فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ۔ تم اپنے جذبات کے پیچھے مت چلو۔

معیارِ عدل:

اس باب میں، اپنے قلبی رجحانات کو اثر انداز مت ہونے دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات تمہیں عدل کرنے سے روک دیں۔ وان تلوآ۔۔ نہ ہی تم کوئی پیچدار۔ ذومعنی بات کرو۔ اوتعرضوا۔ نہ ہی اس سے اعراض برتو، پہلوتہی کرو۔۔۔ اس لئے کہ: فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ (4:135)۔ جو کچھ تم کرتے ہو، خدا کو اس کی خبر ہوتی ہے۔ تم اس سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔ یہ ہے عدل کا وہ معیار جو ایک مومن کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جو اس صفت کے حامل ہوں، اس معاشرہ کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس میں یہ نہیں ہوگا کہ اپنی پارٹی کا آدمی ہے تو اس کے لئے میزان اور ہوگی اور دوسری پارٹی کے آدمی کے لئے اور۔ اس میں تو دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔: وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ (5:8)۔ دیکھنا ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اس سے بھی عدل کرو۔ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۫ (5:8)۔ تقویٰ سے قریب ترین روش یہی ہے۔۔۔۔ عدل کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کی ایک شکل وہ ہے، جسے عدالتی عدل کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنا۔ اس کے متعلق قرآن کریم کا حکم ہے کہ: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (4:58)۔ جب تم لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، تو ہمیشہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔۔ عدالتی عدل کے معنی یہ ہیں کہ فیصلہ قانون کے مطابق ہو۔ لیکن قرآن

کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ کیا جارہا ہے، خود ہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کی رو سے کیا ہوا فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل کہلا سکے گا۔ لہٰذا، جماعتِ مومنین کے متعلق قرآن میں ہے: أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ۝ (7:181)۔ یہ جماعت ''الحق'' کے مطابق لوگوں کی راہنمائی کرتی ہے اور اسی (الحق) کے ساتھ عدل کرتی ہے۔ یعنی قوانین ''الحق'' پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور انہی قوانین کے مطابق یہ لوگوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ''الحق'' قرآن کریم ہے کیونکہ خود خدا کا ارشاد ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (5:44)۔ جو لوگ معاملات کے فیصلے قرآن کے مطابق نہیں کرتے، سو وہی کافر ہیں۔

واجب حق:

عدل کی دوسری شکل یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا واجب حق ادا کر دیا جائے۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے۔ یہ وہ عدل ہے جو ہر شخص کی زندگی میں قدم قدم پر سامنے آتا ہے۔ اور مومن اس میں ہر مقام پر پورا اترتا ہے۔ آپ سوچئے کہ جس معاشرے میں ہر شخص کو اس کا حق، بلا کدوکاوش اور بلا پریشانی وتشویش ملتا جائے، اس میں زندگی کس قدر خوشگوار گزرے گی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے ایسے جامع الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں پھیلانے سے زندگی کا ہر گوشہ اس کے دائرے کے اندر آجاتا ہے۔ اس نے کہا ہے: وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ (6:152)۔ ''ماپ اور تول کو عدل وانصاف کے ساتھ پورا کرو۔'' ماپ اور تول میں ہر قسم کے واجبات آجاتے ہیں۔

احسان:

لیکن قرآن کریم عدل سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ احسان کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، عدل کے معنی ہیں جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ ادا کر دینا۔ لیکن اگر اس سے دوسرے کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو تو قرآن کی تاکید یہ ہے کہ اسے، اس کے واجب سے زیادہ دے کر، اس کی کمی کو پورا کر دیا جائے۔ اسے ''احسان'' کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں، کسی کے بگڑتے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا۔ اور اس طرح معاشرہ میں حسن پیدا کر دینا۔''

اسلامی فیصلے:

طلوعِ اسلام دسمبر 1982ء، صفحہ نمبر 64۔ ''محترم جسٹس جاوید اقبال نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ہے:۔ موجودہ قوانین کے تحت باضمیر مسلمان ججوں کی طرف سے کئے جانے والے فیصلوں کو غیر اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ (روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ 21 اکتوبر 1982ء)۔ ہم محترم جسٹس کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ کسی فیصلے کے اسلامی ہونے کا معیار یہ نہیں کہ وہ کسی باضمیر جج کا موجودہ قوانین کی رو سے دیا ہوا فیصلہ ہو۔ سیکولر نظام میں، اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو وہ عدل کے تقاضا کو پورا کر دیتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ جس قانون کے مطابق فیصلہ دیا گیا ہے وہ قانون بھی اسلامی ہے؟۔ اور قانون کے اسلامی ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق

ہو۔ارشادِ خداوندی ہے:۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (5:44)۔ جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی قانون کتاب اللہ کے مطابق نہیں تو اس کی رو سے فیصلہ دینے والا جج کتنا ہی باضمیر کیوں نہ ہو، اس کا فیصلہ اسلامی قرار نہیں پا سکتا۔ اسی لئے قرآن نے انہی ججوں کو صاحبِ عدل کہا ہے جو ''وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ'' (7:181) یعنی جو الحق (کتاب اللہ) کے مطابق فیصلے دیتے ہیں۔ لہٰذا، رائج الوقت قوانین کے مطابق فیصلوں کو اسلامی تصور کرنے اور ایسا قرار دینے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ قوانین بھی اسلامی (کتاب اللہ کے مطابق) ہیں؟۔ کیا انہوں نے ان قوانین کو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا ہے کہ وہ اسلامی ہیں؟۔''

(جاری ہے)

ضرورت رشتہ

قرآنی گھرانے کے نوجوان جس کی عمر 29 سال ہے۔ قد پانچ فٹ گیارہ انچ دبئی ملازمت بطور چارٹیڈ اکاؤنٹنٹ کے لئے قرآنی گھرانے کی ہم پلہ لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔

رابطہ نمبر 0321-6627559

قارئین متوجہ ہوں

کینیڈا میں مقیم احباب میں سے کسی کو جنوری 1972ء سے دسمبر 2016ء تک کے شمارے مطلوب ہوں تو بلا قیمت دستیاب ہیں۔ صرف ڈاک خرچ اپنے ذمہ لینا ہوگا۔ شام 8 بجے سے 10 بجے تک درج ذیل فون نمبر پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

ایم رفیق راجہ رابطہ نمبر: 001-613-932-7252

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ

Cell: 0321-4460787 Phone: 042-35714546

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلی قسط

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کا مفہوم کیا ہے

مرض، تشخیص اور علاج

(ایک جامع مقالہ جس سے اسلامی حکومت کا تصور اور نقشہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے)

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی!

آج میں جس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں، وہ جس قدر اہم ہے اسی قدر (بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ) نازک بھی ہے۔ اس لئے جو حضرات مطمئن ہیں کہ ہمارا مروجہ اسلام بالکل صحیح ہے اس میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے، نہ اصلاح کی گنجائش۔ کمی صرف اتنی ہے کہ لوگ اس پر عمل نہیں کر رہے۔ تو یہ حضرات میری ان گذارشات کا مطالعہ کرنے کی زحمت نہ فرمائیں اس سے انہیں کسی قسم کا فائدہ پہنچنا تو کجا، الٹی کوفت ہوگی اور میں ایسا قطعاً نہیں چاہتا۔ اس سفر میں میرے ہم رکاب وہی حضرات ہوں جو سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا مروّجہ اسلام وہ دین نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے حضور نبی اکرم ﷺ نے متمکن فرمایا تھا۔ وہ احباب جو اس حقیقت سے متفق ہیں کہ ہماری خرابیوں اور تباہیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے مروّجہ اسلام کو حقیقی دین سمجھ رکھا ہے اور اس کے بعد اس کے متمنی اور متلاشی ہیں کہ وہ حقیقی الدین کیا تھا اور اس کے دوبارہ متمکن ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ وہی میرے ہم عنان ہو سکتے ہیں کہ ؎

زمرغانِ چمن نا آشنایم — بشاخِ آشیاں تنہا سرایم
اگر نازک دلی ازمن کراں گیر — کہ خونم می تراود از نوایم
(اقبالؒ)

ترجمہ: میں اپنے ہی چمن کے پرندوں سے ناآشنا ہوں۔ اپنے آشیانے کی شاخ پر تنہا (بیٹھا) گاتا رہتا ہوں۔ اگر آپ نازک دل ہیں تو مجھ سے کنارہ گیر ہو جائیں کیونکہ میرے گیتوں سے خون ٹپکتا ہے۔ (س۔ا)

ہمارے اختلافات:

آپ صدرِ اسلام کے مختصر سے عرصہ سے آگے بڑھئے تو آپ کو ہماری صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ ہمارے باہمی انتشار وخلفشار اور افتراق واختلاف کی حدیثِ خونچکاں دکھائی دے گی اس اختلاف وانتشار سے اس وقت میری مراد سیاسی اختلاف

نہیں سرِ دست میری مراد مذہبی یا شرعی اختلافات سے ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ بھی ہمارے (صدیوں سے چلے آنے والے) مرّوجہ اسلام کا کرشمہ ہے جس سے ہمارے سیاسی اور شرعی اختلافات الگ الگ شعبوں میں بٹ جاتے ہیں۔ حقیقی اسلام میں اس تقسیم وتفریق کا بھی کوئی تصور نہیں بہرحال، زیرِ نظر مقالہ میں میرا مرکزی موضوع شرعی اختلافات ہی ہیں جن کی وجہ سے ہم (جنگ تو ایک طرف) امن کے زمانہ میں بھی اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کسی نے ان جگر پاش اختلافات کا سبب یا اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی ہے؟

(2) اگر کی ہے تو وہ کسی نتیجہ پر پہنچے یعنی تشخیص کیا تھی؟

(3) اور تشخیص کے بعد کیا اس کا علاج سوچا گیا؟

اس کے بعد، لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ، یا تو کسی نے اس مہلک مرض کی تشخیص کی طرف توجہ نہیں کی۔

(2) اگر تشخیص کی کوشش کی تھی تو یا تو وہ تشخیص غلط تھی یا علاج صحیح نہیں تھا۔

(3) اگر تشخیص اور علاج دونوں صحیح تھے تو وہ علاج کیا ہی نہیں گیا اس لیے کہ نہ صرف یہ کہ اس سے مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا، بلکہ وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ اب اس کی عالمگیریت کی یہ کیفیت ہے کہ ہر جگہ اس کی شکایت ہوتی ہے لیکن علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور جس طرح یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ مرض لاعلاج ہے مریض پر وہ مایوسی چھا جاتی ہے جسے ''سکون قبل از مرگ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح تشتت وافتراق کے اس مزمن مرض کو اب زندگی کا معمول سمجھ کر گوارا کر لیا گیا ہے۔

میری قریب قریب تمام عمر، قرآنِ کریم پر غور وتدبر اور اُمت کے احوال وکوائف کے مطالعہ میں گزری ہے اور اب میں زندگی کے اس مرحلہ پر پہنچ رہا ہوں جہاں اگلا کنارہ پچھلے کنارے کے مقابلے میں قریب تر ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنی عمر بھر کے غور وتدبر کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور جس کا میں جستہ جستہ اظہار کئے چلا آرہا ہوں اسے جامع طور پر قوم کے سامنے پیش کر دوں۔ ہوسکتا ہے کہ دیدہ ورانِ قوم جو اس سے متفق ہوں، اس کے علاج کی طرف توجہ مبذول کریں، یا (کم از کم) آنے والے اربابِ فکر ونظر اس سے استفادہ کر سکیں۔

میں اسے بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ:

(1) میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں میں، (ارشادِ باری تعالیٰ اور اعلانِ حضور نبی اکرم ﷺ کے مطابق) صرف مسلم ہوں قرآنِ کریم کی ابدیت اور نبوتِ حضور نبی اکرم ﷺ کی خاتمیت پر میرا ایمان ہے۔

(2) جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس سے میرا مقصد کسی کے عقیدہ یا مسلک پر تنقید یا تنقیص نہیں۔

(3) نہ ہی اس سے مقصود بحث وتمحیص ہے۔

میں اپنے حاصل تدبر کو نہایت غیر جانبدارانہ انداز سے، خارجی طور پر (Objectively) پیش کر دینا چاہتا ہوں جو اس سے اختلاف کریں، وہ اسے مسترد کر دیں مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

میں اتنا اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری تحقیق و تشخیص کا مدار ''دین'' کے حقائق پر ہے اور ہماری (موجودہ) قوم کا تعلق ''مذہب اسلام'' سے ہے اور یہی اصل مشکل ہے۔ دین، اپنے دعاوی کو قرآنی اسناد اور علمی دلائل کی بناء پر پیش کرتا ہے اور فریق مخالف سے بھی دلائل ہی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن مذہب کا تعلق سراسر جذبات سے ہوتا ہے، جسے عام الفاظ میں عقیدت مندی کہا جاتا ہے اور عقیدت، اصولوں سے نہیں، شخصیتوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ آپ کسی اصول یا نظریہ سے اختلاف کریں گے تو فریق مخالف کے جذبات بہت کم مشتعل ہوں گے لیکن اگر اس گفتگو کے دوران کسی ایسی شخصیت کا ذکر آ جائے جس سے اس کی عقیدت وابستہ ہے تو وہ مرنے مارنے پر اتر آئے گا۔ تلاش حقیقت کے راستے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے خاردار وادیوں سے گزرنا ہوگا جس عقیدہ یا مسلک کے سلسلہ میں بات ہوگی وہ کسی نہ کسی شخصیت کی طرف منسوب ہوگا اس لئے ہزار احتیاط کے باوجود، شخصیتوں کا درمیان میں آ جانا، ناگزیر ہوگا۔ بقول غالب ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس سلسلہ میں، میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے غیر مذاہب کی کسی ایسی شخصیت کے خلاف جسے وہ واجب الاحترام قرار دیتے ہوں، کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ان لوگوں کے لئے دل آزاری کا باعث ہو چہ جائیکہ میں خود اپنے ہاں کی واجب العزت شخصیتوں کے خلاف کوئی ایسی بات کہوں۔ خیال صرف اتنا رہے کہ جب میں کسی نظریہ یا مسلک پر تنقید کروں تو جن شخصیتوں کی طرف وہ منسوب ہو، اسے ان کی تحقیر پر محمول نہ کیا جائے۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد، اصل موضوع کی طرف آیئے:

1۔ اُمت واحدہ:

آپ کسی مسلمان سے پوچھئے خواہ اس کا تعلق کسی فرقے سے ہو، وہ اس سے متفق ہوگا حتیٰ کہ غیر مسلم مورخین بھی اس کی تصدیق کریں گے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے عہد ہمایوں میں، مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ سب ایک اُمت کے افراد تھے۔ مذہب کا تعلق پوجا پاٹ، بھگتی اور پرستش کے طور طریق یا اخلاقیات کے پند و نصائح سے ہوتا ہے جن پر ہر فرد، اپنے اپنے طور پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ لیکن دین نظام زندگی کا نام ہے جس کے لئے اجتماعیت بنیادی شرط ہے۔ اس لئے قرآن نے ایک اُمت کی تشکیل کی تھی۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143) ''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنایا تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو، اور تمہارا رسول، تمہارے اعمال کا نگراں ہو۔''

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (3:109)

تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو اور اس حقیقت پر ایمان رکھو کہ معروف و منکر کا تعین خود خدا نے کر دیا ہے۔

2۔ وحدت کیسے پیدا ہوتی ہے:

سوال یہ ہے کہ افراد میں وحدت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے۔ آپ کسی شاہراہ پر دیکھئے اس پر مختلف سواریاں موٹر کاریں، رکشائیں، موٹر سائیکل، عوامی سائیکل وغیرہ مختلف سمتوں میں رواں، دواں، آجا رہے ہوں گے۔ کوئی دائیں کو، کوئی بائیں کو کوئی سامنے کی طرف، کوئی پیچھے کی۔ ان میں کہیں یکسانیت دکھائی نہیں دے گی لیکن جونہی وہ اس گول دائرے پر پہنچیں گے جو مختلف سڑکوں کے جائے اتصال پر بنا ہو، ان میں سے ہر ایک بائیں کی طرف مڑ جائے گا ان سب میں سمت کی وحدت پیدا ہو جائے گی۔

یہ وحدت کس طرح پیدا ہوگئی؟ اس طرح کہ جس مملکت کے یہ باشندے ہیں، اس کا قانون ہے بائیں طرف چلو اس قانون کی پابندی سے ان میں وحدتِ سمت پیدا ہوگئی۔

لہٰذا، افراد میں وحدت پیدا کرنے کے لئے ایسے قانون کی موجودگی ضروری ہے جس کا تمام افراد پر یکساں اطلاق ہو۔

لیکن تنہا قانون کافی نہیں اس کے لئے اس اتھارٹی کی بھی ضرورت ہے جو اسے نافذ کرے اسے ہیئتِ حاکمیہ (یا نظامِ حکومت) کہا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس چوراہے یا گول دائرے کی ہم نے اوپر مثال دی ہے، وہاں ٹریفک کا ایک سپاہی کھڑا ہوتا ہے جو اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ اس قانون کی پابندی ہو رہی ہے۔

اس اتھارٹی کی اہمیت ایک اور مثال سے، زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آئے گی۔ آپ بادشاہی مسجد میں دیکھئے لاکھوں کا مجمع، نماز جمعہ کے لیے بیٹھا ہے۔ جماعت کھڑی ہو جاتی ہے۔ امام کی ایک آواز پر یہ سب کبھی جھک جاتے ہیں۔ کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کبھی بیٹھ جاتے ہیں آخر سلام پھیر لیتے ہیں۔ لاکھوں کے اجتماع میں اس قسم کی وحدت کی مثال بہت کم ملے گی۔

باجماعت فرض پڑھ لینے کے بعد، صحنِ مسجد پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیے وہی نماز ہے وہی اس کی رکعتیں وہی رکوع وہی سجود، وہی قعود لیکن کوئی کھڑا ہے۔ کوئی رکوع میں، کوئی سجدے، میں کوئی قعدہ میں، کوئی دعا مانگ رہا ہے، کوئی جوتا اٹھائے باہر جا رہا ہے۔ مسجد بھی وہی ہے اور نمازی بھی وہی ہیں لیکن ان کی وہ وحدت گم ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ اختلاف ہی اختلاف ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ ایک امام کے نہ ہونے سے۔ لہٰذا، اُمت میں وحدت کے لیے ضروری ہے کہ:

(1) ایک قانون ہو جس کی سب اطاعت کریں اور

(2) ایسی اتھارٹی ہو جو اس قانون کو نافذ کرے اور اس کی پابندی کرائے۔

3۔ عدالت:

آپ کسی کچہری میں جائیں وہاں سینکڑوں افراد مصروفِ تگ و تاز نظر آئیں گے یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ ہیں جن میں کسی معاملہ میں اختلاف ہو گیا اور انہوں نے اس کے تصفیہ کے لیے عدالت کی طرف رجوع کیا ہے۔ عدالت ان میں قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی اور ان کا اختلاف مٹ جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جس قانون کے مطابق عدالت نے فیصلہ دینا ہے، اس سے یہ لوگ (فریقین) واقف ہیں۔ اگر یہ خود واقف نہیں تو وکلا موجود ہیں جنہیں ان قوانین کا علم ہے، لیکن یہ وکلا ان کے تنازعہ (مقدمہ) کا فیصلہ نہیں کر سکتے وہ ایسا کرنے کے مجاز نہیں، ان کا فیصلہ قانون کی نظروں میں قابل قبول نہیں ہوگا۔ خواہ وہی فیصلہ کیوں نہ ہو جو عدالت دے گی اس سے واضح ہے کہ اختلافات مٹانے اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تین عناصر لاینفک ہیں، یعنی (1) قانون، (2) قوت نافذہ یا مرکزی اتھارٹی اور (3) عدالت۔

4۔ قانون شکنی اور بغاوت:

اگر مملکت کا کوئی فرد، کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو حکومت کی طرف سے اس کا مواخذہ کیا جاتا ہے۔ اسے جرم اور اس کی سزا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پاکستان میں رہتے ہوئے، بھارت کے قانون کو اتھارٹی تسلیم کرتا ہے تو اسے، حکومت پاکستان کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔ بغاوت کے معنی یہ ہیں کہ وہ مملکت پاکستان کے ہم دوش ایک اور مملکت قائم کرتا ہے اسے کوئی مملکت بھی برداشت نہیں کر سکتی نہ ہی وہ اسے برداشت کرے گی کہ کوئی فرد (یا جماعت) اس مملکت کے اندر رہتے ہوئے، قانون سازی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے اسے بھی اس مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔

ہم نے وحدت اُمت اور دین کے نظام کو سمجھانے کے لیے دورِ حاضر کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس لئے کہ جب اسلام کے صدرِ اوّل میں، دین کا نظام قائم ہوا تھا تو اس قسم کی اصطلاحات رائج نہیں تھیں، اور جن الفاظ میں اس نے اپنے نظام کو سمجھایا ہے ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک انہیں دورِ حاضرہ کی اصطلاحات کے تقابل یا تناظر میں سامنے نہ لایا جائے مثلاً قرآنِ کریم میں، نہ کہیں قانون کا لفظ آیا ہے نہ نظام کا نہ مملکت کا نہ عدالت کا نہ مرکزی اتھارٹی کا، نہ ہیئت حاکمہ کا۔ ان کے لیے اس کے اپنے الفاظ ہیں، اور جب تک ان الفاظ کا مفہوم، مرّوجہ نظامِ سیاست واسلوب حکومت کی روشنی میں سامنے نہ آئے، دین کے نظامِ حیات کا تصور سامنے نہیں آ سکتا، بالخصوص جب وہ نظام دینا میں کہیں موجود نہیں، اور اس کی جگہ مذہب (یعنی مرّوجہ اسلام) نے لے رکھی ہے جس کا اس نظام سے کوئی تعلق نہیں۔

الٰہ، عبادت، کلمات:

قرآنِ کریم میں حاکم یا صاحبِ اقتدار کے لئے الٰہ کا لفظ آیا ہے۔ محکومیت کے لئے عبادت یا عبدیت کا اور قوانین کے لئے کلمات اللہ یا حدود اللہ کا۔ اس کے نظام کی امتیازی خصوصیت یا انفرادیت اس میں ہے کہ اس میں حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خواہ اس کی کچھ بھی پوزیشن کیوں نہ ہو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اس کی حیثیت مقننہ کی ہو اور خواہ انتظامیہ کی، (اسے کتاب حاصل ہو، خواہ حکم)

حتیٰ کہ نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔

حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ''اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کی جائے۔'' اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40) ''یہی محکم دین (نظام) ہے جسے خدا نے عطا فرمایا ہے۔'' ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40)

شرک:

ہم نے پہلے بتایا ہے کہ کسی مملکت میں رہتے ہوئے کسی دوسری مملکت کے قانون کو اتھارٹی تسلیم کرنا، بغاوت کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے لئے شرک کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ جب اس نے کہا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (6:57) تو اس کے ساتھ ہی واضح کر دیا کہ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ (18:26) ''وہ اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔'' (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) وہ قانون سازی یا حکومت کا حق کسی انسان کو نہیں دیتا حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں اس لئے اس نے خدا کی محکومیت اختیار کرنے والوں سے کہہ دیا کہ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (28:87) ''دیکھنا! تم کہیں شرک نہ کرنے لگ جانا۔'' وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ ''خدا کے ساتھ کسی اور کو صاحب اقتدار تسلیم نہ کر لینا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ (28:88) ''حکومت اسی کے لئے مختص اور مخصوص ہے۔'' خدا کا عبد (محکوم) وہی ہو سکتا ہے جو وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ (18:110) ''اپنے رب کی محکومیت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

ضابطہ قوانین:

قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا خدا کی حکومت، کسی ڈکٹیٹر کی حکومت نہیں کہ وہ جو جی چاہے حکم دے دے، اس کی اطاعت لازم آئے گی۔ اس نے کہا کہ حکمرانی قانون کی ہوگی، اور خدا نے اپنی حکمرانی کے لئے ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے جسے قرآنِ مجید کہا جاتا ہے۔ یہ ضابطہ قوانین، رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملا تھا، لیکن اس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ ان قوانین کا اطلاق خود رسول اللہ ﷺ پر بھی اسی طرح ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں پر، واضح رہے کہ کسی مملکت کے قوانین کا اطلاق انہی لوگوں پر ہو سکتا ہے جو اس مملکت کے حقِ اقتدار کو تسلیم کریں۔ مملکت خداوندی کے حقِ اقتدار کو تسلیم کرنے کو ''خدا پر ایمان لانا'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ خدا پر ایمان لانا خود رسول کے لیے بھی ضروری تھا۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ (2:285) ''جو کچھ خدا نے رسول پر نازل کیا، خود رسول بھی اس پر اسی طرح ایمان لاتا ہے جس طرح دوسرے مومن۔۔۔''

2۔ خود رسول بھی اسی ضابطہ قوانین کا اتباع کرتے تھے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ (6:50) ''ان سے کہو کہ میں خود اسی ضابطہ قوانین کا اتباع کرتا ہوں جسے خدا نے میری طرف وحی کیا ہے۔'' (7:203، 33:2) ''دوسری جگہ ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (10:15) ''میں اسی کا اتباع کرتا ہوں جسے خدا نے میری

طرف نازل کیا ہے اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں ہوسکتا۔''

اس ضابطہ قوانین کی خصوصیات اس قدر ہیں کہ ان صفحات میں ان کا احاطہ ممکن نہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(ا) خدا نے جو احکام بذریعہ وحی دینے تھے وہ سب اسی کتاب (قرآن) کے اندر منضبط کر دیئے تاکہ لوگوں کو اس کی تلاش نہ کرنی پڑے کہ فلاں قانون کس جگہ ملے گا۔ تمام احکامِ خداوندی اس ایک کتاب کے اندر مذکور ہیں۔ یہی حضور ﷺ کے ہم عصروں کے لئے ضابطہ، ہدایت تھی اور یہی آپ ﷺ کے بعد آنے والے (قیامت تک کے) انسانوں کے لئے ضابطہ قوانین ہے۔ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (6:19)

(ب) چونکہ یہ کتاب انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی (خدا کی نازل فرمودہ تھی) اس لئے ساری دنیا کو چیلنج دیا گیا کہ اس کی مثل قوانین مرتب کر کے دکھاؤ۔ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ ۪ وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ (2:23) ''اگر تمہیں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہو تو اس کی ایک سورت کی مثل مرتب کر کے دکھاؤ اور اپنے ساتھ اپنے ہمنوا ساتھیوں کو بھی شریک کر لو اس سے واضح ہو جائے گا کہ تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو یا جھوٹے۔

(ج) یہ کتاب اپنی ہر بات کو اس طرح واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ اس کے مطالب کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کا ابہام رہتا ہے نہ الجھاؤ وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (16:89) ''اور ہم نے تیری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جو ہر بات کو کھول کھول کر بیان کرتی ہے۔

(د) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝ (4:82) ''کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سی اختلافی باتیں پاتے۔

(س) خدا نے جس قدر احکام و قوانین انسانوں کو دینے تھے، وہ سب اس میں آ گئے اس لئے یہ ہر اعتبار سے مکمل ہے اور جو قوانین اس میں دیئے گئے ہیں وہ ایسے محکم ہیں کہ ان میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں نہ ہی کسی کو اس کا حق حاصل ہے کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے۔

وَتَمَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ (6:115، 18:27) تیرے رب کے جملہ قوانین اس کتاب میں صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے انہیں تبدیل کرنے والا کوئی نہیں۔

حتیٰ کہ رسول کو بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ ۚ (10:15) ''اے رسول! ان سے کہہ دو کہ مجھے اس کا اختیار ہی نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر سکوں۔''

(ش) اس کتاب کو ہر اعتبار سے مکمل اور ناقابل تغیر و تبدل قرار دینے کے بعد اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝ (15:9) ہم ہی نے اسے نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

(ص) اس کے بعد نوع انسان سے کہہ دیا کہ یہ کتاب تمہاری راہنمائی کے لئے کافی ہے۔ اَوَ لَمۡ یَکۡفِہِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ ؕ (29:51) ''اے رسول! ان لوگوں سے پوچھو کہ کیا یہ ضابطہ قوانین جسے خدا نے تیری طرف نازل کیا ہے، اور جسے تو نے ان کے سامنے پیش کر دیا ہے (چھپا کر نہیں رکھا) کیا یہ ان کی راہنمائی کے لئے کافی نہیں؟''

حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ (12:40) اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ ؕ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (12:40) یہی محکم نظامِ زندگی ہے۔ خدا اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَّلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ۝ (18:26)۔

حکومت:

ضابطہ قوانین کیسا ہی منفرد اور مکمل کیوں نہ ہو، محض پند و نصائح کی کتاب ہے اگر اس کے ساتھ ''قوت نافذہ'' یا حکومت نہ ہو۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ (24:55)

ہم نے ان لوگوں سے، جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (33:27) یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے سابقہ اقوام کو بھی اس قسم کی حکومت عطا کی تھی۔ اس حکومت کا مقصد یہ ہوگا کہ اس دین (نظام زندگی) کو استحکام حاصل ہو جائے جسے ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف امن سے بدل جائے گا تاکہ وہ نہایت اطمینان اور سکون سے صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کر سکیں اور ان پر کسی کا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کی بھی اطاعت کریں اور اس کے ساتھ کسی اور قانون کی بھی، اور اس طرح شرک کے مرتکب ہو جائیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں کیسے عظیم حقائق ایک ہی آیت میں سمو کر رکھ دیئے ہیں یعنی

(i) یہ حکومت بزورِ شمشیر حاصل نہیں کی جائے گی یہ ''ایمان و اعمال صالحہ'' کا فطری نتیجہ ہوگی۔

(ii) دیکھنے کے لئے کہ ہمارا ایمان اور اعمال قرآنی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے نتیجہ میں ہمیں اس قسم کی حکومت ملتی ہے یا نہیں۔

(iii) اس حکومت کا مقصد، کمزور انسانوں پر ظلم و استبداد اور سلب و نہب نہیں ہوگا اس کا مقصد دین کا تمکن ہوگا۔

(iv) دین کا تمکن، اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔

(v) اس قسم کی حکومت کے بغیر، احکامِ خداوندی کو نافذ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ صدرِ اوّل کی جماعت مومنین کے متعلق

فرمایا کہ: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ (22:41) ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض ملک میں حکومت۔۔۔ حاصل ہوگی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کریں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں گے اور ان کے تمام معاملات آخرالامر قوانین خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔

حضور ﷺ کی حکومت:

یہ ضابطہ حیات اور حکومت عطا ہونے کے بعد حضور ﷺ سے فرمایا کہ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (5:48) ''ان میں ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو اور ان کے معاملات کا فیصلہ اسی کے مطابق کرو۔'' آپؐ نے ان لوگوں سے واضح طور پر کہہ دیا کہ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (6:114) ''اے میری دعوت کے مخالفو! کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسا ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے جو بڑا مفصل ہے۔''

قرآنِ کریم میں ''یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ'' کے جس قدر احکام آئے ہیں وہ اسی حکومت کے فرائض ہیں۔

عدالت:

حکومت کا زیادہ تر تعلق انتظامی معاملات سے ہوتا ہے جہاں تک افراد کے اختلافات کا تعلق ہے ان کا فیصلہ عدالت کے ذریعے ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کا یہی منصب تھا جس کے متعلق فرمایا کہ: فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (4:65)

خدا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنائیں۔ اور جو فیصلہ تم صادر کرو اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کریں کہ اپنے دل کہ گہرائیوں میں بھی ان کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں۔

اس عدالت کی طرف رجوع کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ان کے ختلافات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہو جائے۔ اخْتَلَفْتُمْ فِیْہِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ ط (42:10) ''جن معاملات میں بھی اختلاف ہو، ان کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے لیا کرو۔'' ظاہر ہے کہ جب فیصلہ اس کتاب کی رو سے ہونا تھا جس کی صداقت پر ان کا ایمان تھا، اور اس جج (رسول ﷺ) کی وساطت سے، جس کی امانت پر بھی ان کا ایمان تھا۔ تو پھر اس فیصلہ کے خلاف دل میں گرانی کس طرح پیدا ہو سکتی تھی؟ قرآن تو آیا ہی اختلافات مٹانے کے لئے تھا (16:64)۔

کفر اور اسلام میں خط امتیاز:

ان تصریحات کے بعد واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۝ (5:44) جو

لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہتے ہیں۔

یہ تھا وہ نظام جس نے اُمت میں وحدت پیدا کر دی تھی۔ ایک ضابطہ قوانین جس کے مطابق اُمت کے تمام انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس کی تاکید اس اُمت کو ان الفاظ میں کر دی گئی تھی کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (3:103)

اعتصام بحبل اللہ:

تم سب کے سب، بلا استثناء، اجتماعی طور پر کتاب اللہ کے ساتھ، محکم طور پر وابستہ رہو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا ہونے دو۔ تم ذرا اپنی پچھلی حالت پر غور کرو جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور تم میں باہمی عدوات تھی خدا نے اس حالت میں تمہیں ایسا ضابطہ زندگی اور نظامِ حیات عطا کیا جس سے تم میں (ظاہری اتحاد ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے تمہارا اس طرح ایک اُمت بن جانا، خدا کا کتنا بڑا انعام تھا۔ تم اس سے پہلے ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس نظامِ خداوندی نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ اللہ اس طرح اپنے قوانین وضوابط اور ان کے نتائج وثمرات واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔ اس آیہ جلیلہ سے تین اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

(1) اعتصام (وابستگی) صرف حبل اللہ (کتاب اللہ) کی مطلوب ہے۔ کسی اور چیز کی نہیں۔

(2) یہ وابستگی (اطاعت) انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی (جمیعا) ہے۔ اسی ضابطہ قوانین کی اطاعت میں اُمت واحدہ کی تشکیل، استحکام اور بقا کا راز مضمر ہے۔

(3) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا تو مثبت حکم ہے اس کے برعکس تفرقہ سے منع کیا گیا ہے۔ تفرقہ کا مطلب کیا ہے، یہ سمجھنے کی بات ہے۔ اس کے لئے ٹریفک کے چوراہے کی مثال سامنے لائیے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مملکت کے قانون کی اطاعت کرنے والی جماعت بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ جو لوگ (اس قانون کے برعکس) کسی اور قانون کی اطاعت کرنا چاہتے تھے، وہ ان سے الگ ہو کر، دائیں جانب مڑ گئے اسے (یعنی الگ ہو جانے کو) تفرقہ کہتے ہیں، اور اس طرح الگ ہو جانے والوں کو فرقہ۔

شرک کے عنوان کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے اس میں بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کے سوا کسی اور قانون کی اطاعت کرنا، شرک ہے یہ اطاعت کسی اور مملکت کے قانون کی ہو، یا خود اپنا فیصلہ، ان میں کوئی فرق نہیں ان میں سے کسی کی اطاعت بھی ہو، وہ شرک کے زمرہ میں آجاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (45:23) ''تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا حکمران بنا لیا قانونِ خداوندی کے بجائے، اپنے فیصلوں کا اتباع کرنے

لگ گیا۔'' یہ بھی شرک ہے کیونکہ اس سے بھی وہ جماعت (اُمت) سے الگ ہوجاتا ہے۔ اس کو تفرقہ کہتے ہیں اور قرآن کریم نے بہ نصِ صریح تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے فرمایا: وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (30:31-32) ''اے جماعت مومنین! دیکھنا تم مشرکین میں سے نہ ہوجانا، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کردیا اور ایک الگ فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔''

اس فرقہ بندی سے کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ ہر فرقہ اس خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ میرا فرقہ حق پر ہے اور باقی سب باطل پر، (حالانکہ) جب اُمت فرقوں میں بٹ جائے تو کوئی فرقہ بھی حق پر نہیں رہتا۔ حق پرستی تو مشروط ہی اُمت کی وحدت سے ہے۔

اس کے بعد ایک اور حقیقت پر بھی غور کیجئے جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، شرک کے معنی اپنی مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغاوت کرنے والوں کا اپنی ملکت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا اس لئے فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ (6:159) ''جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کردیا اور خود ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں وہ اس مملکت کے باغی ہیں۔''

حقیقی شرک تفرقہ ہے:

ہمارے ہاں شرک، صرف بت پرستی کو کہا جاتا ہے۔ (میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس کا یہ مفہوم کیوں وضع کیا گیا؟) لیکن قرآنِ کریم نے ایک مقام پر یہ بھی واضح کردیا ہے کہ بت پرستی بے شک باطل ہے لیکن اس کی بنیاد جہالت ہے۔ حقیقی شرک تفرقہ ہے۔ داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے باہر تشریف لے گئے اور قوم کی نگہبانی حضرت ہارونؑ کے سپرد ہوئی، تو قوم نے گئو سالہ پرستی اختیار کرلی۔ حضرت موسیٰؑ واپس تشریف لائے تو سخت برا فروختہ ہوئے اور حضرت ہارونؑ سے بڑی سختی اور درشتی کے ساتھ پوچھا کہ یہ کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا اور تم اطمینان سے بیٹھے رہے۔ تم نے انہیں اس سے روکا کیوں نہ؟ حضرت ہارونؑ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں انہیں اس سے منع کرتا تو قوم میں پھوٹ پڑ جاتی اور تم مجھ سے ناراض ہوجاتے کہ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (20:94) ''تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کردیا۔'' میں نے ان کی بت پرستی کو تو کچھ وقت کے لیے گوارا کرلیا لیکن ان میں تفرقہ پیدا نہیں ہونے دیا اس جواب سے حضرت موسیٰؑ مطمئن ہوگئے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفرقہ کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔ یہ بت پرستی کے شرک کے مقابلہ میں، کہیں زیادہ خطرناک شرک ہے۔

اختلاف:

تفرقہ (فرقہ بندی) سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے اسے قرآن نے کفر قرار دیا ہے اور روسیاہی کا موجب بنایا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (3:104)

اے جماعت مومنین! دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جو خدا کی طرف سے واضح راہنمائی آجانے کے بعد، فرقوں میں بٹ گئے اور آپس میں اختلاف پیدا کرلیا اس کا نتیجہ سخت تباہی کا عذاب ہوگا۔

اگلی آیت میں ہے کہ یہ روش ان کی روسیاہی کا موجب ہوگی۔

(ضمناً) مشاورت میں مختلف آراء اور مختلف خیالات سامنے آئیں گے۔ یہ وہ اختلاف نہیں جس سے منع کیا گیا ہے۔ اختلاف یہ ہے کہ معاملہ زیر بحث کے متعلق فیصلہ ہوجانے کے بعد، اس کی مخالفت کرکے ایک الگ ٹولہ بنالیا جائے جس اختلاف کا نتیجہ، تفرقہ (فرقہ پرستی) ہو، وہ اختلاف کفر ہے اور اس کا نتیجہ (فرقہ بندی) شرک۔

''بات واضح ہے کہ جب بھی قرآنِ کریم کے سوا کسی اور قانون، حکم یا فیصلہ کی اطاعت کی جائے گی تو اس سے تفرقہ پیدا ہوگا اور جب اُمت میں تفرقہ پیدا ہوجائے وہ فرقوں میں بٹ جائے تو پھر اسلام باقی نہیں رہتا! اسلام اور اُمت کی وحدت لازم وملزوم ہیں اور اُمت کی وحدت نتیجہ ہوتی ہے خالص کتاب اللہ کی اطاعت کا۔''

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

کہا یہ جائے گا (اور جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا یہ کہا جاتا ہے) کہ قرآنِ کریم نے اللہ کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اگر دین نام ہے خالص اللہ (یعنی کتاب اللہ) کی اطاعت کا، تو رسول ﷺ کی اطاعت کے حکم خداوندی کی تعمیل کس طرح کی جائے گی؟ اس اطاعت کا ذریعہ تو قرآن سے خارج ہی ہوگا۔

یہی ''دو اطاعتوں'' کا تصور یا عقیدہ سرچشمہ ہے اس تمام افتراق واختلاف، اور تشتت اور انتشار کا جس میں اُمت ہزار برس سے مبتلا چلی آرہی ہے۔ یہی ساری بحث کا نقطہ ماسکہ ہے اور یہی میرے اس مقالہ کا موضوع۔ میں نے کافی غور وخوض کے بعد مناسب یہ سمجھا ہے کہ قرآن کی اس اصطلاح کا مفہوم تو یہاں بیان کردیا جائے اور اس مفہوم کی وضاحت دلائل اور قرآنی اسناد، آخر میں جاکر سامنے لائی جائیں، کیونکہ اس امر کا فیصلہ اسی وضاحت اور سند کے بعد ہوگا کہ ہمارا مروجہ اسلام، حقیقی اسلام ہے جس میں کسی اصلاح اور تغیر وتبدل کی ضرورت نہیں یا حقیقی اسلام کچھ اور ہے۔

منفرد نظامِ حکومت:

نزولِ قرآن کے زمانے میں عربوں کے ہاں منظّم حکومت کا وجود تو ایک طرف، تصور تک بھی نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے منظّم حکومت (یا نظامِ حکمرانی) کا تصور ہی نہیں دیا بلکہ اسے دین کی غایت یا منتہیٰ قرار دیا لیکن اس نے جس قسم کی حکومت کا

تصور دیا وہ دنیا جہاں سے نرالہ تھا۔ انبیاء سابقہ کے استخلاف فی الارض کا نقشہ تو اسی قسم کا ہوگا لیکن زمانہ نزولِ قرآن میں اس کے آثار تک مٹ چکے تھے۔ جو حکومتیں اس وقت دنیا میں قائم تھیں، قرآن کا پیش کردہ تصور ان سے یکسر مختلف تھا۔ یہ وجہ ہے جو قرآن نے ان لوگوں کے ہاں کی سیاسی یا حکومتی اصطلاحات کو استعمال نہیں کیا۔ ان لوگوں کے تصور حکومت میں، حکمرانی کسی نہ کسی شکل میں انسانوں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ قرآن کا تصور یہ تھا کہ کسی انسان کو حق حکومت حاصل ہی نہیں حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ جس کی تعمیل کا ذریعہ اس کی کتاب میں مندرج قوانین و احکام ہیں۔ لہٰذا اطاعت صرف خدا (بالفاظ دیگر خدا کی کتاب) کی جائز ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ کے یہی معنی ہیں۔

لیکن کتاب یا اس میں لکھے ہوئے احکام وقوانین تو ساکت وصامت (خاموش) ہوتے ہیں۔ ان کی اطاعت کس طرح کی جاسکتی ہے؟ اگر اسلام بھی ایک مذہب ہوتا تو ہر شخص ان احکام کی اطاعت اپنے اپنے طور پر کر لیتا لیکن یہ تو الدین (یعنی ایک اجتماعی نظام) ہے جس میں ان قوانین کی اطاعت اجتماعی طور پر ہوگی اور یہ چیز ایک منظّم حکومت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ تنہا کتابوں سے یہ ممکن نہیں۔

قرآن نے کہا کہ اس کے لئے بے شک ایک منظّم حکومت کی ضرورت ہے لیکن اس حکومت میں کسی انسان کو قانون سازی کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس حکومت کا فریضہ، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا ہوگا اس کے لئے کس کس قسم کے طریق اور اسلوب اختیار کئے جائیں گے اسے وہ نظامِ اُمت کے باہمی مشورہ سے خود طے کرے گا۔

اس انداز کی حکومت پہلے پہل، حضور نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمائی جس کی مرکزی اتھارٹی وہ خود تھے۔ اس حکومت کا فریضہ، احکام وقوانین خداوندی کا نفاذ تھا اور بس۔ اس ضمن میں جو آیات پہلے گذر چکی ہیں، انہیں ایک بار پھر سامنے لایئے ان سے اس نظامِ حکومت کے بنیادی خط وخال واضح ہو جائیں گے یعنی۔

1۔ اس میں کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں تھا حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں، کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے۔

2۔ حکومت کا فریضہ، احکام وقوانینِ خداوندی پر عمل کرانا تھا۔

3۔ حکومت کا سربراہ، سب سے پہلے ان احکام وقوانین کی اطاعت خود کرتا تھا۔

4۔ قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کے تغیّر وتبدل، حک واضافہ یا ترمیم وتنسیخ کا حق کسی کو حاصل نہیں تھا۔

5۔ افرادِ مملکت، ان قوانین کی اطاعت اپنے اپنے طور پر نہیں کرتے تھے بلکہ حکومت کے نافذ کردہ طریق کے مطابق کرتے تھے نظر بظاہر یہ اطاعت نظامِ حکومت کی تھی لیکن درحقیقت یہ اطاعت خدا کی اطاعت تھی۔

اس قسم کے نظامِ حکومت کے لئے دنیا میں کوئی اصطلاح موجود نہیں تھی۔ قرآن نے اس کے لئے اپنی اصطلاح وضع کی اور وہ اصطلاح تھی ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی یعنی خدا کی اطاعت، اس نظام کی رو سے جس کا سربراہ رسول ﷺ ہے۔ ذیل کی آیت میں اسی نظامِ حکومت کا نقشہ ان الفاظ میں مرتب کر دیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

(4:59)

اے جماعت مومنین! تم اس نظامِ حکومت کی پوری پوری اطاعت کرو جسے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرانے کے لیے اس کے رسول نے قائم کیا ہے۔ اس کا تنظیمی نقشہ یہ ہے کہ اس کی ایک مرکزی حکومت ہے اور اس کے ماتحت، افسران مجاز، ان افسروں کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ایسا ہو کہ تم میں اور ان ماتحت افسروں میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس کے لئے مرکزی حکومت کی طرف رجوع کرو۔ یہ شہادت ہوگی اس امر کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطہ قوانین اور مکافاتِ عمل پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ اور مآل کار معاشرہ کا توازن برقرار رکھنے کا موجب ہوگی۔

اس میں ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' سے مراد اس نظام کی مرکزی حکومت ہے اور اولی الامر سے مراد، افسرانِ ماتحت۔ ان افسروں کے فیصلہ کے خلاف، مرکزی حکومت میں اپیل دائر کی جا سکے گی لیکن اس حکومت کا فیصلہ حرفِ آخر ہوگا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس مفہوم کی قرآنی اسناد اور تائیدات، آگے چل کر پیش کی جائیں گی یہاں صرف اتنی وضاحت کافی ہوگی کہ اگر ''اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' سے مراد، رسول اللہ ﷺ کی ذات کی اطاعت لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نظام کو حضور ﷺ کی ارضی حیات تک ہی رہنا تھا اس کے بعد ختم ہو جانا تھا۔ لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں اللہ تعالیٰ کا دعویٰ ہے کہ اسلام، تمام نوع انسان کے لئے آخری اور مکمل دین ہے، اس لئے اسے حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی رہنا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن نے خود ہی (یہ کہہ کر) وضاحت کر دی کہ:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۗىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

(3:144)

محمد ﷺ بجز! این نیست کہ اللہ کا رسول ﷺ ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی رسولؑ آئے اور (اپنی مدتِ حیات پوری کرنے کے بعد) دنیا سے چلے گئے سو اگر یہ رسول ﷺ بھی کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے، تو کیا تم (یہ سمجھ کر دین تو حضور ﷺ کی زندگی تک محدود تھا۔ جب آپ ﷺ دنیا میں نہ رہے تو دین کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا) اپنی زمانہ قبل از اسلام کی روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ جو ایسا کرے گا وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) اللہ کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا (ان کے برعکس) جو لوگ اس نظام پر قائم رہیں گے انہیں اس کا اجر ملتا رہے گا۔

حضور ﷺ کے بعد:

یعنی یہ نظام، حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی اسی طرح قائم رہے گا اور آگے چلے گا۔ اور ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی عملی شکل اس نظام کی اطاعت ہوگی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے، حضور ﷺ کی وفات پر، جب جماعتِ مومنین میں کہرام مچ رہا تھا، ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

ایھا الناس من کان یعبد محمدا فانہ قد مات ومن کان یعبد اللہ فانہ حی لا یموت۔۔۔

اے لوگو! جو شخص محمد ﷺ کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھا وہ جان لے کہ اس کا حاکم وفات پا گیا ہے لیکن جو اللہ کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھا تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ زندہ ہے۔ اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اللہ کے زندہ رہنے سے مراد یہ تھی کہ اس کی کتاب محفوظ ہے جو ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حکومت رہے گی۔ اس کی عملی شکل کے متعلق خود رسول اللہؐ نے فرمادیا تھا کہ:

علیکم بسنتی وسنتہ الخلفاء الراشدین المھدیین۔۔۔

(مشکوٰۃ باب اعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریق کا اتباع لازم ہے اور (میرے بعد) میرے خلفاء (جانشینوں) کے طریق کا جو خدا کی راہنمائی میں خود بھی چلتے رہیں گے اور تمہیں بھی چلائیں گے۔

حضور ﷺ کے بعد ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا عملی مفہوم اسی نظام کی اطاعت تھی جو حضور ﷺ کے سچے جانشینوں کے ہاتھوں قائم رہا اسی کو دیگر متعدد روایات میں ''تمسک بالجماعت اور اطاعتِ امیر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد:

حضور ﷺ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہ نظامِ حکومت قائم رہا اور ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کے فریضہ کی ادائیگی میں نہ کوئی عملی دشواری پیش آئی، اور نہ ہی اس کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں کوئی ذہنی الجھاؤ پیدا ہوا۔

اس کے بعد، اس نظام کی جگہ ملوکیت آ گئی جس میں ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی جگہ انسانوں کی حکومت نے لے لی اس سے نہ وہ نظام باقی رہا نہ اس کی مرکزیت نہ جماعت رہی، نہ اس کی وحدت دین، سیاست سے الگ ہو کر مذہب بن گیا، اور اس تبدیلی کے ساتھ ہی قرآن کی اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ اب الٰہ کے معنی ہو گئے۔ ''وہ جس کی پرستش کی جائے'' عبادت کے معنی ہو گئے ''پرستش پوجا'' توحید کے معنی ہوئے یہ ماننا کہ ''خدا ایک ہے'' اور شرک کا مفہوم ہو گیا ''بت پرستی۔'' نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مذہبی شعائر قرار پا گئے جنہیں انفرادی طور پر اور ہر طرح کی حکومت کے تابع ادا کیا جا سکتا ہے۔ خدا کی حکمرانی سے مراد ہو گیا، خارجی کائنات میں اس کی حکومت۔

لیکن یہاں پہنچ کر انہیں ایک دقت پیش آئی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ تو احکامِ خداوندی تھے۔ ان کی ادائیگی سے ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ'' کا فریضہ ادا ہو گیا لیکن ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا فریضہ کس طرح ادا ہو؟ اس کا ذریعہ کیا ہو؟ اس کے متعلق سوچا یہ گیا کہ یہ اطاعت نبی اکرم ﷺ کے ارشادات کی اطاعت کی رو سے ہو سکے گی لیکن اس میں پھر ایک اور دقت پیش آئی قرآنِ مجید تو مدون اور مرتب شکل میں موجود تھا لیکن ارشادت نبوی ﷺ کا کوئی ایسا مجموعہ موجود نہیں تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کرایا تھا۔ یہی نہیں کہ آپ ﷺ نے خود ایسا مجموعہ مرتب نہیں کرایا تھا بلکہ صحابہؓ کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ حضور ﷺ کے اقوال کو لکھیں۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔۔۔

مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو جس نے قرآن کے سوا کچھ اور لکھ لیا ہو، وہ اسے مٹا دے۔ مسند امام احمدؒ میں ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا:

ہم لوگ جو رسول اللہ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے ایک دن رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیتے ہو ہم نے عرض کیا کہ حضور ﷺ سے جو کچھ ہم لوگ سنتے ہیں اسے لکھ لیا کرتے ہیں تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ پھر فرمایا، خالص رکھو اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو (صحابہؓ کہتے ہیں کہ) ہم نے جو کچھ لکھا تھا اسے ایک میدان میں اکٹھا کیا اور جلا دیا۔

(بحوالہ تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، ص:249)

چنانچہ حضور ﷺ نے، حجۃ الوداع کے خطبہ میں، لاکھوں کے اجتماع میں اعلان فرمایا کہ:

وانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ۔۔۔

(صحاح بحوالہ سیرۃ النبی علامہ شبلیؒ، جلد دوم، ص:156)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد، حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے اُمت کے لئے کیا چھوڑا ہے۔ انہوں نے جواب دیا مابین الدفتین یعنی مجلد قرآن کریم یہی حضرت محمد بن حنفیہؒ نے بھی کہا۔

(صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، جلد سوم، ص:143)

حضور ﷺ کے بعد، صحابہؓ کے دور میں بھی ایسا ہی ہوا یعنی انہوں نے بھی، نہ یہ کہ احادیث نبوی ﷺ کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کرایا جس کے پاس کوئی تحریری نوشتہ موجود تھا اس نے اسے جلا دیا یہ حقیقت ایسی مسلمہ ہے کہ اس کی تائید میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں تفصیل اس اجمال کی، ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ نہایت اہم کتاب ''مقامِ حدیث''

میں ملے گی نیز میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب میں اور اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس قدر مجموعہ ہائے احادیث موجود ہیں (جو تیسری صدی میں مرتب ہوئے تھے) ان میں، ان سے پہلے کی کسی کتاب کا نہ حوالہ ملتا ہے نہ اقتباس۔

قوانین کی جزئیات:

یہ جو واقعہ ہے کہ نہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کیا، نہ مرتب ہونے دیا نہ ہی خلفائے راشدین نے ایسا کیا، تو ایسا سہواً نہیں کیا گیا دانستہ کیا گیا یہ خدا کے پروگرام کے مطابق تھا۔ قرآنِ کریم مکمل ضابطۂ حیات ہے لیکن اس کی صورت ایسی ہے کہ اس میں (بجز چند احکام) اقدار و اصول دیئے گئے ہیں ان اصولوں کی جزئیات خود ہی متعین نہیں کیں یہ اس لئے کہ دین کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہنے تھے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق اور ان قوانین کی جزئیات کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنا تھا اگر وہ جزئیات بھی قرآن کریم کے اندر دے دی جاتیں تو وہ بھی غیر متبدل قرار پا جاتیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ جب زمانے کے احوال و کوائف کے بدل جانے سے ان جزئیات پر عمل درآمد مشکل (بلکہ ناممکن) ہو جاتا، تو امت خود نفسِ اسلام ہی سے بدظن ہو جاتی اور خیال کر لیتی کہ اسلام ماضی کے کسی زمانے میں تو ممکن العمل تھا، لیکن اب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا (جیسا کہ پاکستان میں ہوا ہے۔ حکومت نے ہزار برس پہلے کے تعزیری احکام کو اسلامی احکام کہہ کر نافذ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد، خود صدرِ مملکت کو اعتراف و اعلان کرنا پڑا کہ ان احکام پر عمل درآمد ناممکن ہے۔ اس سے ہماری نئی نسل کے دل میں نفسِ اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات ابھرنے شروع ہو گئے ہیں۔) اس سے وہ خود دین ہی کو خیر باد کہہ دیتی۔ قرآن کریم نے سورہ المائدہ کی حسب ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝ (5:101-102)

اے جماعت مومنین! جن امور کی تصریحات ہم نے خود نہیں کیں انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر (بفرض محال) ان امور کو بھی قرآن میں دے دیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہ ہو سکے گی اور جب تغیرّ حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائے گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم (بنی اسرائیل) نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادے ہی کو اتار پھینکا لہٰذا جن جزئیات کا تعین ہم

نے خود نہیں کیا تو انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت ایک حدیث میں ملتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ باتیں فرض قرار دی ہیں۔ تو انہیں ضائع نہ کرو کچھ باتیں حرام ٹھہرائی ہیں، تم ان کے قریب تک نہ پھٹکو اس نے کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ امور کے بیان کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ تم ان کے متعلق کرید مت کرو کیونکہ خدا نے ایسا بھول کر نہیں کیا دانستہ کیا ہے۔

(مشکوٰۃ، باب اعتصام بکتاب وسنت)

نبی اکرم ﷺ نے نظامِ حکومت قائم فرمایا تو قرآنِ کریم کے اصول وقوانین کی جزئیات بھی خود متعین کیں اور اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق بھی۔ یہ سب کچھ صحابہؓ کے مشورہ کے ساتھ (کیونکہ ایسا کرنے کا حضور ﷺ کو حکم دیا گیا تھا (3:159)) اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کیا تھا۔ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہیں رہنا تھا۔ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان میں ردوبدل ہونا ضروری تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں عہدِ رسالت کی کئی ایک جزئیات میں تبدیلی اور اضافہ کیا گیا (تفصیل میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں ملے گی۔) حضور ﷺ نے اپنے ان ارشادات کو اس لئے مرتب کرنے سے روک دیا کہ اُمت انہیں غیر متبدل خیال کرے گی اور اس سے اسی مشکل میں پھنس جائے گی جس کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے خود بھی انہیں مرتب نہ فرمایا اور صحابہؓ کو بھی ایسا کرنے سے منع فرما دیا حضور ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اس سنت نبوی ﷺ کا اتباع کیا اور احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہ فرمایا۔ یہ وجہ تھی جو جامعینِ حدیث کو اپنے سے پہلے کا مرتب شدہ کوئی مجموعۂ نہ مل سکا اگر قرآنی نظامِ حکومت، خلافت راشدہ کے بعد مسلسل آگے چلتا تو ضابطہ قوانین بنانے کے لئے ان مجموعوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ یہ تو اس نظام کے معدوم ہوجانے کا نتیجہ تھا جو ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا مختلف مفہوم ذہنوں میں آیا جس کی وجہ سے اس مقصد کے لئے احادیث کے جمع کرنے کی ضرورت پڑی۔

ان مجموعوں کو کس نے مرتب کیا، اور کس طرح مرتب کیا؟ یہ داستان بھی غور طلب ہے۔ ویسے تو احادیث کے مجموعے کثرت سے ہیں، لیکن ان میں سے (سنیوں کے ہاں) چھ مجموعے مستند سمجھے جاتے ہیں، جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات کے چار مجموعے الگ ہیں۔

یہ کس طرح مرتب ہوئے، اس سلسلے میں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان (جامعین احادیث) کے پاس کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے لوگوں سے کہا کہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی کوئی روایت کسی سے سنی ہو، وہ ان تک پہنچا دے۔ ان صحاح ستہ میں، مسلم اور بخاری کو صحیحین کہا جاتا ہے اور ان میں بھی بخاری کو سرفہرست رکھا جاتا ہے چنانچہ اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ اس طرح ان کے پاس قریب چھ لاکھ روایات جمع ہوئیں ان

میں سے انہوں نے قریب پانچ لاکھ، ترانوے ہزار کو مسترد کر دیا اور باقی سات ہزار (جنہیں انہوں نے اپنے قیاس کے مطابق صحیح سمجھا) اپنے مجموعہ میں شامل کر دیا ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی (2762) کے قریب رہ جاتی ہیں۔ان ہر شش جامعین کے کوائف حسب ذیل ہیں:

نمبر شمار	نام اور وطن	وفات	کتنی روایات ملیں	کتنی قابل قبول سمجھیں
1۔	امام بخاریؒ (بخارا)	256ھ	چھ لاکھ	2762
2۔	امام مسلمؒ (نیشاپور)	261ھ	تین لاکھ	4348
3۔	ترمذیؒ (ترمذ)	275ھ	تین لاکھ	3115
4۔	ابوداؤدؒ (سیستان)	275ھ	پانچ لاکھ	4800
5۔	ابن ماجہؒ (قزوان)	273ھ	چار لاکھ	4000
6۔	نسائیؒ (صوبہ خراسان کا گاؤں نسا)	303ھ	دو لاکھ	4321

ان تصریحات سے دو باتیں واضح ہیں یعنی

(1) یہ تمام حضرات ایرانی تھے۔ان میں سے ایک بھی عرب کا رہنے والا نہیں تھا۔

(2) انہوں نے یہ روایات اس طرح جمع کیں کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ اس نے یہ بات اپنے باپ (یا استاد) سے سنی تھی۔انہوں نے اپنے باپ (وغیرہ) سے اور اس طرح یہ سلسلہ دو سو سال پیچھے جاتے جاتے زبانی کلامی، رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گیا۔آپ غور کیجئے کہ اس طرح روایت در روایت کے متعلق کسی صورت میں بھی یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔اس طرح کے بیان کو تو عدالتوں میں بطور شہادت بھی تسلیم نہیں کیا جاتا یعنی اگر کوئی گواہ کہے کہ مجھے اس بات کا ذاتی طور پر علم نہیں لیکن میں نے فلاں سے ایسا سنا ہے، تو عدالت اسے شہادت کے طور پر قبول نہیں کرے گی چہ جائیکہ اس طرح سنی سنائی باتوں کا سلسلہ قریب دو سو سال تک مختلف راویوں کی زبانی آگے چل کر آیا ہو! پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ ان روایات میں بعینہٖ الفاظ نہیں دہرائے جاتے تھے ان الفاظ کا مفہوم آگے منتقل ہوتا تھا یعنی حضور نبی اکرم ﷺ نے کچھ ارشاد فرمایا سننے والے نے اس کا جو مفہوم سمجھا اسے کسی اور کو بتایا اس نے اس سے جو کچھ سمجھا اسے آگے منتقل کر دیا اور اس طرح یہ مفہوم در مفہوم چھ سات راویوں کے ذریعہ آخر الامر جامع احادیث تک پہنچا۔کیا اس مفہوم کو کسی صورت میں بھی قول رسول اللہ ﷺ کہا جا سکے گا؟

(3) اس طرح کے قریب چھ لاکھ روایات (بلکہ مفاہیم) امام بخاریؒ تک پہنچے۔ان میں سے انہوں نے اپنے قیاس کے مطابق جس روایت کو صحیح سمجھا اسے رکھ لیا باقیوں کو مسترد کر دیا۔سوال یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے پاس وہ کونسا معیار تھا جس کی رو سے وہ یقینی طور پر صحیح اور غلط میں فرق کر لیتے؟ انہوں نے بہر حال، اپنی رائے اور قیاس کے مطابق ہی یہ تفریق کی تھی۔

اب سوچئے کہ جس روایت کو صحیح حدیث کہا جاتا ہے اس کے یقینی طور پر ارشاد رسول اللہ ﷺ ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ یہ مفاہیم مختلف منازل میں سے گذرے اور آخر میں امام بخاریؒ نے اپنے قیاس سے کسی کو صحیح اور کسی کو غلط قرار دے دیا! جنہیں صحیح احادیث رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے، وہ وہ روایات ہیں، جنہیں جامعینِ احادیث نے اپنے قیاس کے مطابق صحیح سمجھا اس سے زیادہ ان کی صحت کی کوئی سند نہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہر حدیث اس طرح درج ملے گی کہ ''قال رسول اللہ ﷺ''۔۔۔ اس کے بعد اس حدیث کے الفاظ اور آخر میں ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ'' یوں، یا جس طرح رسول اللہ نے فرمایا ہو! اس بنا پر، ان لاکھوں حدیثوں میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں جسے خود جامعین حدیث نے یقینی طور کہا ہو کہ حضور ﷺ نے ایسے ہی فرمایا تھا!

یہ ہے پوزیشن ان احادیث کی جو کتبِ احادیث میں جمع ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی اطاعت سے ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ جب سوال پیدا ہوا کہ یہ تو انسانوں کی بیان کردہ روایات ہیں جنہیں انسانوں نے اپنے قیاس سے بعض کو صحیح اور بعض کو ضعیف قرار دیا، اس لئے ان سے یہ فریضہ کیسے ادا ہو جائے گا تو یہ روایت وضع کی گئی کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''مجھے قرآن اور قرآن کے ساتھ اس کی مثل کچھ اور بھی دیا گیا اور وہ میری احادیث ہیں۔'' اس مبینہ روایت کے الفاظ غور طلب ہیں۔

علامہ ابوبکر خطیب بغدادیؒ نے اپنی کتاب ''کفایہ'' میں لکھا کہ:

> ''حضرت مقدام بن معدیکربؓ نے فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی یاد رکھو! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی یاد رکھو! عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ لازم پکڑ لو اسی قرآن کو جو کچھ اس قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔''

قطع نظر اس کے کہ جو کچھ اس شخص کی طرف منسوب ہے قرآن کی رو سے حقیقت وہی ہے، اس روایت کے الفاظ بالبداہت کہہ رہے ہیں کہ یہ الفاظ حضور ﷺ کے نہیں ہو سکتے۔ حضور ﷺ کی لطافت، ذوق، شائستگی و مزاجِ حسنِ تکلم کے شایان شان ہی نہیں کہ آپ ﷺ اس قسم کے استہزاء آمیز الفاظ استعمال فرماتے۔۔۔ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت دسمبر 1952ء میں، اس روایت کی اسناد کا تجزیہ کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ قطعاً وضعی ہے۔

اس روایت کی رو سے، روایات کو قرآن کی مثل قرار دینے کے بعد دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تو تمام نوعِ انسان کو چیلنج دیا تھا کہ اس قرآن کی ایک سورۃ کی مثل لا کر دکھاؤ تو یہ روایات قرآن کی مثل کیسے ہو سکتی ہیں؟

اس کے جواب میں ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا کہ احادیث بھی وحی ہیں۔ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی متلو جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور دوسری وحی غیر متلو، جس کی تلاوت نہیں کی جاتی یہ احادیث ہیں۔ (یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا) قرآن میں کہیں بھی وحی کی دو قسمیں نہیں بتائی گئیں اس کی رو سے وحی کی ایک ہی قسم ہے اور وہ قرآن کے اندر مذکور و محفوظ ہے۔ (جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مسلمانوں کی خود ساختہ اور خلافِ قرآن شریعت

قرآنِ کریم ایسے ابدی حقائق بیان فرماتا ہے جن کا اطلاق قیامت تک ہوتا ہے اور یہ قرآنِ کریم کے وحی الٰہی ہونے کی ایک دلیل ہے ورنہ انسانی ذہن کوئی ایسی حقیقت anticipate نہیں کرسکتا جو ابدی حقیقت وحیثیت رکھتی ہو۔ قرآنِ کریم نے پوری انسانیت کو یہ چیلنج کیا ہے کہ ذہن انسانی کسی بھی بلندی پر پہنچ جائے۔ لیکن اس میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے لئے خیر وشر کا تعین کرسکے ارشادِ عالی ہے وَعَسٰٓی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰٓی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ (2:216) ترجمہ ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک شے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمہارے لیے بُری ہو، اللہ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ یعنی یہ بات ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم اپنے حق میں نافع یا مضر سمجھو تو وہ واقع میں بھی تمہارے حق ہیں ویسی ہی ہو بلکہ ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اپنے لئے مضر سمجھو اور وہ مفید ہو اور کسی چیز کو مفید خیال کرلو اور وہ مضر ہو۔ تمہارے نفع ونقصان کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جو قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہے۔ اس موجودہ دور تک یہ اصولی حقیقت بطور ایک چیلنج عقل انسانی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسی لئے عقل انسانی اپنے لئے ایسے قوانین نہیں بنا سکتی جو پوری انسانیت کے لیے مفید (wholesome) ہوں قرآن کریم نے انسانوں کو قانون سازی کا اختیار ہی نہیں دیا کیونکہ عقل انسانی جب بھی کوئی قانون بنائے گی وہ انسانیت کے ایک حصہ کے لئے نقصان دہ ہوں گے، اور ایک حصہ کے لئے مفید ہوں گے۔ جب انسانوں نے مل جل کے رہنا شروع کیا تو سب سے پہلے قبیلے اور خاندان وجود میں آئے۔ جب طاقتور لوگوں اور افراد خاندان نے خودغرضی اور لالچ وحرص کی وجہ سے ایک دوسرے پر دست درازیاں شروع کیں، تو رفتہ رفتہ ایسے قانون وضع ہوئے جو کمزور لوگوں کی حفاظت کرتے تھے۔ معاشرہ کو ایک نظم ونسق کے ساتھ چلانے کے لئے قوانین وضع ہوئے۔ یہ قوانین اپنے حالات کے مطابق، وقتی اور علاقائی ہوتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انقلابِ فرانس کے بعد قوانین کی بنیاد رسم ورواج کے بجائے فلسفیانہ نظریات پر رکھی گئی۔ چنانچہ اب قانون کی اساس عدل وانصاف، آزادی، مساوات قرار دی گئی۔

واضح رہے کہ انسانوں کی زندگی اور معاشرہ کی تعمیر میں انسانی قانون کا کردار منفیانہ ہوتا ہے، معاشرہ میں ظلم وناانصافی کو روکنے کے لئے یہ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اگر انسان ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں اور ہر شخص کو اس کے حقوق ازخود ملتے رہیں، تو انسانی قوانین کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس کے برخلاف اسلامی قوانین کا معاشرہ کو درست رکھنے میں بڑا Postive کردار ہوتا ہے جس کی تفصیلی وضاحت آگے آتی ہے۔

انسانی قانون کی اطاعت انسان ازخود نہیں کرتے۔ خارج کی ایک قوت ان قوانین کی اطاعت کراتی ہے۔ جبکہ اسلامی قوانین کی اطاعت انسان، اپنی ذات (نفس) کی پرورش اور اس کے تزکیہ کے لیے ازخود کرتا ہے قرآنی قوانین کا احترام جزو ایمان ہوتا ہے۔ جبکہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا کوئی احترام نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے انسان کی بنائی ہوئی کوئی چیز بھی احترام کی مستحق نہیں ہوتی۔ ہر انسان برابر ہے اور برابری کا درجہ رکھتا ہے اس لئے ایک انسان کی وضع کردہ کوئی چیز بھی دوسرے انسان کے لئے باعثِ احترام اور مقدس نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً سیاسی امور میں یہ بات اور بھی واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ ہمارے ہاں قانون ساز اسمبلیوں اور دستور کے تقدس کا بار بار ذکر ہوتا ہے کہ فلاں لیڈر یا فلاں پارٹی نے اسمبلی کا تقدس مجروح کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسمبلی کے بیشتر ممبران، چور، ڈاکو اور لٹیرے ہیں، مفاد پرست ہیں اس درجہ کمزور سیرت کے حامل ہوتے ہیں کہ ان کی سیرت خود احترام کی مستحق نہیں ہوتی۔ اسمبلی کا تقدس ان کے در و دیوار سے نہیں ہوتا۔ سابق صدر ضیاء الحق نے کئی بار یہ بات کہی تھی کہ دستور کی کیا حیثیت ہے یہ میری جیب میں ہے میں جس وقت چاہوں اس کو پھاڑ سکتا ہوں۔

ہم میں جمہوریت کا بھی بہت چرچا ہے۔ جمہوریت کوئی ضابطۂ حیات نہیں ہے۔ یہ صرف حکومتی مشینری چلانے کا ایک طریقہ ہے۔ بھارت میں تقریباً 68 سال سے جمہوریت چل رہی ہے۔ لیکن وہ ایک دن بھی ضابطۂ حیات نہیں بنی۔ لوگوں کے وہی سیاہ ترین عقائد، ذات پات اور جاتی کی تقسیم موجود ہے دلت اس درجہ پست حالت میں ہیں کہ ان کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ جمہوریت نے ان کے معاشرے میں کوئی اصلاح نہیں کی۔ غریب اب بھی غریب اور امیر اب بھی امیر۔ مسلمان مغربی جمہوریت اس لئے نہیں اختیار کرسکتے کہ یہ قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔ قرآن نے فرقہ بندی اور اُمت میں ہر طرح کے افتراق کو شرک قرار دیا ہے (30:32) فرقہ بندی کرنے والوں کا نہ رسول اللہؐ سے کوئی تعلق رہتا ہے (6:159) اور نہ قرآن سے (3:103) مغربی جمہوریت میں امت آپس میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں دین وسیاست میں کوئی تفریق نہیں جس طرح فرقہ بندی دین میں شرک ہے، اسی طرح سیاست میں پارٹی سازی شرک ہے۔

مغربی جمہوریت کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس نظام میں صرف امیر لوگ حصہ لے سکتے ہیں اور کوئی غریب آدمی اس نظام میں حصہ نہیں لے سکتا کیونکہ کوئی غریب آدمی کسی جگہ سے بھی الیکشن نہیں لڑسکتا کیونکہ الیکشن لڑنے میں زر کثیر استعمال ہوتا ہے۔ انگلینڈ میں صدیوں سے جمہوریت جاری ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک کوئی مزدور، کسان، معمولی دوکاندار، دھوبی، مالی کسی اسمبلی کا ممبر نہیں بنا نہ جمہوریت میں مستقل اقدار کا تصور ہے۔ اس میں سارا کاروبار expediency پر ہوتا ہے۔ ایک پارٹی کے 4 ووٹوں کی اکثریت حق و باطل کا فیصلہ کردیتی ہے۔ آپ یہ بھی غور فرمائیں کہ ہمارے ہاں تشکیل پاکستان کے بعد سے کتنے قانون ہیں جو اسمبلی میں غریب لوگوں کے لیے پاس ہوئے ہیں۔

قرآنِ کریم انسانوں کو قانون سازی کا حق نہیں دیتا قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اسی لئے اس نے حضرت نوحؑ کے دور سے انبیاء کرامؑ کی بعثت کا سلسلہ جاری کیا جو اپنے ساتھ قوانین لے کر آتے تھے اور وہ ان قوانین کے مطابق

ایک نظام جاری کرتے تھے وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (2:213) ترجمہ: اور ان انبیاء کے ساتھ کتاب اتاری کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات میں جھگڑا کریں۔ یہ انبیاء کرامؑ بڑی عظیم ہستیاں ہوتی تھیں جو بڑے بڑے پیروں یا صوفیوں کی طرح صرف پرستش یا وعظ نہیں کرتے تھے وہ تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیتے تھے۔ وہ باطل کے نظام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ پھینک دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ کتاب کے مطابق نظام قائم کرتے تھے جس میں انسانوں کے نہیں بلکہ اللہ کے قوانین جاری کرتے تھے۔ قانون سازی کے متعلق تو قرآنِ کریم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک اصولی ابدی حکم جاری کیا جس میں کبھی کوئی تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی ارشادِ عالیٰ ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (5:44) ترجمہ: جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ لوگ کافر ہیں۔ کس طرح واضح حکم ہے اور آنکھوں کو لگانے کے قابل۔ اس آیت سے ہی اگلی آیتوں میں ایسے لوگوں کو کافر کے ساتھ ساتھ ظالم (5:45) اور فاسق (5:44) بھی کہا ہے۔ ہمارے ہاں بنو عباس کے دور میں جس وقت تفاسیر تحریر کرنے کا دور شروع ہوا ہے اس وقت دین مذہب میں پوری طرح تبدیل ہو چکا تھا اور دین کا تصور دور دور تک کہیں نہیں تھا۔ اس لئے ان تینوں آیات کی تفسیر مذہب کی رُو سے کی گئی ہیں اور ہمارے علماء کرام نے اقامتِ دین سے ہر طرح کی گریز کی راہیں تلاش کیں۔ لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ وہ تمام تفاسیر غلط اور سطحی ہیں۔ ان تینوں آیات کی دینی تفسیر پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

ان تینوں آیات کریمات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہیں کرتے یہ تین حکم صادر فرمائے ہیں کہ یہ لوگ بیک وقت کافر، ظالم اور فاسق ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان جرائم میں سے ہر جرم نہایت سنگین جرم ہے جبکہ قرآنِ کریم نے ان لوگوں پر بیک وقت تینوں جرم ثابت کئے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کا نسخہ موجود ہے اور اس کے بعد وہ اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور قرآنِ کریم کے احکامات کی پروا نہیں کرتا، وہ کافر ہے۔ اس موجودہ دور میں ہر اسلامی ملک کی عدالتوں میں قرآنِ کریم کا نسخہ موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عدالت خود ساختہ قوانین کے مطابق فیصلہ کرتی ہے تو یہ آیات اس عدالت پر بھی منطبق ہوتی ہیں۔ خواہ وہ ہائی کورٹ ہو یا سپریم کورٹ ہو۔ اللہ کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط (53:23) ترجمہ: یہ سب نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں اتاری کیونکہ اصلی اور حقیقی عدل صرف قرآن کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور کون عادل ہو سکتا ہے۔ جب کسی انسان کا فیصلہ قرآن کے مطابق نہیں ہوتا تو وہ یقیناً ظلم پر مبنی ہوگا اور وہ شخص ظالم ہوگا۔ قرآنِ کریم کا تیسرا حکم اس کے فاسق ہونے کا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اللہ تعالیٰ کے قانون سے انحراف کیا اور اپنا خود ساختہ یا کسی دوسرے کے خود ساختہ قانون کو نافذ کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی اطاعت سے قدم کو باہر نکال لیا، اور یہی فسق ہے۔ اس طرح اس شخص پر یہ تینوں حکم ثابت ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے جہاں قصاص کا حکم بیان فرمایا ہے وہاں اس نے حُر کے مقابلہ میں عبد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2:178) ترجمہ: آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام۔ عبد کے معنی غلام کے ہوتے ہیں اس لئے عبادت کے معنی محکومیت کے ہوتے ہیں۔ پرستش کے نہیں ہوتے۔ قرآنِ کریم نے دیگر مقامات پر بھی لفظ عبادت کو محکومیت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ (23:47، 12:40) کسی ایک جگہ بھی پرستش کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم صرف تیری محکومی اختیار کرتے ہیں اور کسی اور کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ ہی دین کا خلاصہ ہے اور اس کا اصل الاصول اور اس کی اساس و بنیاد عملی زندگی میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت صرف اور صرف قانونِ خداوندی کی جائز ہے۔ کسی اور کے قانون کی اطاعت جائز ہی نہیں۔

سورۂ یوسف میں ارشادِ عالی ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ترجمہ: حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ نیز یہ کہ اپنے احکامات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ (5:50) اسلام سے پیشتر کا زمانہ الجاہلیہ کہلاتا تھا جس میں صرف توہم پرستی اور مذاہب کا رواج تھا۔ قرآنِ کریم نے فرمایا کہ کیا یہ اب بھی وہی حکم جاہلیت چاہتے ہیں۔ ان سے کہہ دو خدا سے زیادہ احسن، حسین ترین حکم دینے والا کون ہوسکتا ہے وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا (5:50) اس کے احکامات پر عمل کرنے سے زندگی حسین ہوجاتی ہے معاشرہ حسین ہوجاتا ہے، کائنات حسین ہوجاتی ہے لیکن یہ قوانین ان لوگوں کے لئے ہیں۔ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (5:50) صرف اس قوم کے لئے میں جو ما انزل اللہ کے اوپر یقین رکھنے والی قوم ہو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ قوانین ہوں، یا انسانوں کے خود ساختہ قوانین ہوں دونوں کے اجراء و نفاذ کے لیے ایک مملکت کا ہونا ضروری چیز ہے جس میں یہ قوانین جاری ہوں۔ قرآنِ کریم انسانوں کے وضع کردہ قوانین اور انسانوں کے وضع کردہ نظام ہائے حیات دونوں کو بیک وقت condemn کرتا ہے اور صرف اپنے عطا کردہ قوانین اور نظام حیات کو Approve کرتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ قرآن نے اس کی وجہ یہی بتائی ہے کہ انسان کے وضع کردہ قوانین ساری انسانیت کے لئے نافع نہیں ہوسکتے جبکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کے سامنے پوری انسانیت کا مفاد ہوتا ہے اس بارے میں علامہ اقبال کی ایک رباعی بڑی جامع ہے وہ آپ ملاحظہ فرمائیں۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحی حق بینندۂ سودِ ہمہ در نگاہش سود و بہبود ہمہ

رباعی کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کی عقل اپنا مفاد دیکھتی ہے۔ وہ دوسروں کے مفاد کی کوئی فکر نہیں کرتی جبکہ وحی الٰہی پوری انسانیت کے مفاد دیکھتی ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ نظام کی کوئی اساس و بنیاد نہیں ہوتی یہ صرف expediency پر چلتا ہے۔ اس بارے میں بھی علامہ کا ایک شعر بہت معنی خیز ہے فرمایا۔

ایکہ می جوئی نظامِ عالمے جُستہ ای او را اساس محکمے

انہوں نے یہ شعر کمیونزم کے بارے میں کہا تھا کہ اے شخص جو ایک نئے نظام کی تلاش میں ہے کیا تم نے اس نظام کی بنیاد بھی تلاش کر لی ہے۔ کمیونزم کی کوئی بنیاد نہیں تھی اسی لئے وہ نظام روس میں فیل ہو گیا۔ اسلامی نظام کی ایک محکم بنیاد و اساس ہے جس پر اس کی ساری عمارت تعمیر ہوتی ہے اور یہی اساس انسانوں کے لئے خیر و شر Good and Evil کی میزان ہوتی ہے جس کا ذکر ہم آگے کرتے ہیں بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو یہ چند انچ کی جسامت کا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور شئی بھی ہوتی ہے جو اس کی انسانیت ہوتی ہے جو اس کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے۔ جو اس کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت دیتی ہے۔ یہ صلاحیت انسان کو فرداً فرداً نہیں ملتی بلکہ یہ ایک نوعی قسم کی صلاحیت ہے۔ دیگر مذاہب والے اس کو روح کہتے ہیں جو فرداً فرداً ملتی ہے لیکن قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے موسوم کرتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک صلاحیت ہے۔ جب تک یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو اس کو روح کہا جاتا ہے، لیکن جب یہ صلاحیت انسان کی طرف منسوب ہوتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ وہ اہم نکتہ ہے جس کو ہمارے علماء Miss کر گئے۔ اسلام کی ساری تاریخ، خلافتِ راشدہ سے لے کر اس موجودہ دور تک صرف تحریکِ طلوعِ اسلام وہ تحریک ہے جس نے نفس انسانی کا تصور پیش کیا ہے جو خالص قرآن کی تعلیم پر مبنی ہے۔ بچہ کو جو یہ نفس ملتی ہے اس نفس کو نشوونما دینا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ بچہ کے جسم کی پرورش طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے، لیکن اس کی انسانی زندگی کا کوئی تعلق طبعی قوانین سے نہیں ہوتا۔ یہاں انسان وحی الٰہی کا محتاج ہوتا ہے۔ وحی الٰہی وہ اقدار دیتی ہے جس پر عمل کرنے سے اس نفس کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ نفس ہی اسلامی نظام کی اساس ہوتی ہے اور یہ صلاحیت ہی خیر و شر کی میزان ہوتی ہے ہر وہ کام جس سے اس زندگی کی نشوونما ہوتی ہے وہ خیر ہے اور ہر وہ کام جس سے اس نفس انسانی کو اضمحلال و ضعف پہنچتا ہے وہ شر ہے۔ اسلامی نظام کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ اس کی اطاعت سے نفس انسانی کی پرورش ہوتی ہے۔ انسانی وضع شدہ قوانین معاشرہ کی تعمیر میں کوئی حصہ نہیں لیتے جبکہ وحی الٰہی کے قوانین کی اطاعت سے اسلامی معاشرہ کی تعمیر اس طرح ہوتی ہے۔ کہ ہر شخص جس قدر بھی خیر کے امور نفس کی پرورش کے لیے کرتا چلا جائے گا اس سے ریاست و معاشرہ کا نظم و نسق بہتر ہوتا جائے گا۔ اسلامی مملکت کا شہری اس لئے چوری نہیں کرتا کہ چوری کرنے سے اس کے نفس میں ضعف واقع ہوگا چنانچہ نفس کو نشوونما دینے کی وجہ سے کوئی شخص جرم نہیں کرتا، تو اس سے جرم کا انسداد ہوتا ہے اور اس سے معاشرہ بہتر ہوتا چلا جاتا ہے اور اس طرح قرآنی قوانین معاشرہ کی تعمیر میں ایک Positive Role ادا کرتے ہیں۔ سیکولر حکومت کی اطاعت کے لئے انسان میں کوئی Urge نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا کوئی incentive ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت کی اطاعت سے اس کے نفس میں بالیدگی آتی ہے، اس لئے ہر شخص اسلامی مملکت کی اطاعت از خود کرتا چلا جاتا ہے ارشادِ عالی ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ؕ (2:286) اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر یہ کہ اس سے تمہاری ذات میں نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ جس قدر قانونِ خداوندی کی، اسلامی مملکت کے ذریعے

اطاعت کرتے چلے جائیں گے آپ کی ذات میں اس قدر نشوونما ہوتی جائے گی۔ خدا جو آپ پر قیود وحدود عائد کرتا ہے تو یہ اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے آپ کی ذات میں وسعت پیدا ہوتی جائے۔ اسلامی مملکت کی یہ وہ اساس محکم ہے جو سیکولر حکومت کو نصیب نہیں ہوسکتی۔

اسلامی نظام کے لئے ہم عموماً اسلامی حکومت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت میں فرق ہوتا ہے۔ اردو زبان میں چونکہ حکومت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں اس لئے اسلامی حکومت لکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام میں کوئی حاکم یا محکوم نہیں ہوتا۔ اس میں پوری حکومت کو اقتدار حاصل ہوتا ہے (24:55) نہ کوئی کسی کا حاکم نہ کوئی کسی کا محکوم۔ اس کے لئے قریب ترین الفاظ اسلامی ہیئت اجتماعیہ ہوسکتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی پورا مفہوم درست طور پر ادا نہیں کرتے۔ واضح رہے کہ غیر اسلامی نظام میں اسلامی قانون نہیں بن سکتے۔ سب سے پہلی اسلامی ریاست حضور ﷺ نے مدینے میں قائم فرمائی تھی۔ حضور ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ وہ وحی الٰہی میں نازل شدہ احکامات کی اطاعت پہلے خود کریں اور پھر دوسروں سے کرائیں۔ چونکہ مملکت کا رقبہ وسیع وعریض تھا اس لئے حضور ﷺ نے جگہ بہ جگہ، قریہ بہ قریہ اس مملکت کو چلانے کے لئے حکام وافسران مقرر فرما دیئے تھے جن کو قرآنِ کریم نے اولوالامر کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے اور قرآنِ کریم نے ان اولوالامر کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے۔ (4:59)۔ اولوالامر کی اطاعت کو فرض قرار دینا ایک بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے علماء کرام نے اس اطاعت کی فرضیت کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا۔ اولوالامر کی اطاعت کی فرضیت سے چار نتائج برآمد ہوتے ہیں (1) پہلا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس سے ایک نظام کی عملی صورت کھل کے سامنے آگئی کیونکہ اس طرح مقامی حاکم کی اطاعت سے ہی رسول اللہ کی اطاعت ہونے لگی (2) دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ نظام کی اطاعت ہی عبادت خداوندی قرار پا گئی اور انسان کی حکومت انسان پر حرام ہوگئی اور انسان کو اپنا حقیقی مقام معلوم ہوگیا۔ (3) تیسری بات یہ ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتی، انفرادی اطاعت کا تصور ختم ہوگیا اور (4) چوتھا نتیجہ یہ نکلا کہ پرستش کا دروازہ بالکل بند ہوگیا۔ اب اولوالامر کی اطاعت سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت، اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہونے لگی (4:80) رسول اللہ ﷺ کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ آپ قرآن کے احکامات کی جزئیات مقرر فرماتے تھے۔ اپنے دور کے اولوالامر کو ان جزئیات سے مطلع فرماتے تھے اور وہ الوالامر ان جزئیات کی اپنی اپنی Jurisdiction میں اطاعت کراتے تھے، تو اس طرح شریعت بننی شروع ہوگئی۔ حضور ﷺ کے بعد خلافت راشدہ میں بھی اسی طرح احکامات کی جزئیات یعنی اپنی دور کی شریعت بنتی چلی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ کا دور بہت مختصر تھا اس لئے بیشتر جزئیات حضور ﷺ کی مقرر کردہ ہی رائج رہیں۔ حضرت عمرؓ کا دور دس سال تک رہا۔ اس دور میں حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کی مقرر کردہ 40 جزئیات میں تبدیلی کی جو ''اولیات عمر'' کے نام سے موسوم ہیں۔ جس کی تفصیل شاہ ولی اللہ نے اولیات عمر کے نام سے موسوم کی ہیں ان جزئیات کی اطاعت بھی عبادت خداوندی تھی۔ اس طرح حالات کے تقاضوں کے مطابق شریعت میں تبدیلی ہوتی گئی۔ ہمارے ہاں جو موجودہ شریعت یا فقہ

ہے وہ سب قرآن کے خلاف ہے۔اس کی وجوہ ملاحظہ فرمائیں۔

1۔ہم مسلمانوں میں بدقسمتی سے روحِ انسانی کا تصور آیا اور روح کا تزکیہ اور روحانیت کا بڑھانا زندگی کا مقصد قرار دے دیا گیا۔روحانیت کو معاشرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔یہ جنگلوں، پہاڑوں، گوشوں، زاویوں میں پرستش اور مجاہدوں سے حاصل ہوتی ہے۔جو قوم روحانیت کے چکر میں پھنس جاتی ہے وہ تباہ وغارت ہوجاتی ہے۔قرآنِ کریم نے روح کی بجائے نفسِ انسانی کا تصور پیش کیا ہے۔نفس کے عقیدے سے معاشرہ ترقی کرتا ہے اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰیۚ﴿۱۸﴾ (92:18) ترجمہ: جو شخص اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے وَمَنْ تَزَكّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَكّٰی لِنَفْسِهٖؕ (35:18) ترجمہ: جو دوسروں کی پرورش کرتا ہے اس سے اس کی اپنی پرورش ہوتی ہے۔ایسا معاشرہ جو نفس کے تصور پر قائم ہوتا ہے اس میں دوسروں کی پرورش سے اپنی پرورش ہوتی ہے اسلامی قانون وشریعت صرف معاشرہ کے نظم ونسق کو ہی درست نہیں رکھتا، بلکہ اسلامی قانون کی اطاعت سے، نفس انسانی کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔

2۔اسلامی قانون صرف اسلامی ریاست ہی بناسکتی ہے۔غیر اسلامی ریاست اسلامی قانون نہیں بناسکتی۔بنوعباس کی حکومت غیر اسلامی حکومت تھی۔ان کی اطاعت سے اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی تھی۔ہمارا موجودہ فقہ بنوعباس کے دور کے علماء کی ذاتی آراء ہیں۔نہ ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ کوئی sanctity اس کا امام ابوحنیفہؒ اور امام جعفر صادقؒ سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ان بزرگواروں کی کوئی تصنیف بھی موجود نہیں۔بنوعباس کے دور کی اپنی حکومت چلانے کے بھی قوانین ہوں گے۔ان کے ہاں کوئی revenue ڈیپارٹمنٹ ہوگا، پولیس اور فوج کا محکمہ ہوگا، ایک کامیاب حکومت چلانے کے سارے محکمے ہوں گے۔لیکن ان محکموں کے قوانین کا کوئی پتا نہیں چلتا۔اس دور کے قاعدے قانون کا ایک کاغذ نہیں ملتا لیکن یہ جو شریعت کے قانون اس گذشتہ دور کے مولویوں نے بنائے تھے یہ ہم کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔جو گذشتہ دور کا ساتھ دے سکتے تھے لیکن یہ اس دور کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

3۔اسلامی مملکت کا constitution قرآن ہوتا ہے۔اس مملکت میں قانون کا ماخذ صرف قرآن ہے ارشاد عالی ہے وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴿۴۴﴾ (5:44) جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ کافر ہیں۔منزل من اللہ صرف اور صرف قرآن ہے۔اس کے علاوہ کوئی کتاب منزل من اللہ محفوظ نہیں ہے جو شریعت کا ماخذ بنے لیکن ہماری شریعت میں حدیث اور سنت بھی ماخذ قانون ہیں۔

قرآنِ کریم نے مال ودولت جمع کرنا بالکل منع کیا ہے وَیَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَؕ (2:219) حضرت شیخ الہند نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دیجئے جو اپنے خرچ سے بچے۔'' دوسری جگہ فرمایا وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىۙ﴿۳۹﴾ (53:39) ہر آدمی صرف اسی کا حقدار ہے جو اس نے کمایا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْؕ (64:16) خرچ کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے نیز فرمایا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْؕ (2:272) تم جو کچھ مال بھی خرچ

کرو گے وہ اپنے واسطے ہی ہے۔ یہ چند آیات اور اس کے علاوہ بے شمار آیات ہیں جو انفاق کا حکم دے رہی ہیں اور مال و دولت کو جمع کرنے سے منع کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم بھی بہت جگہ آیا ہے۔ سورہ حج میں ارشاد ہے کہ اگر مومنوں کو اقتدار حاصل ہوگا تو وہ زکوٰۃ ادا کریں گے (22:41) یہاں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اپنی حکومت کا ہونا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ حکومت اپنے شہریوں کو زکوٰۃ دے گی یعنی ان کی نشوونما کرے گی۔ سورۃ مومنون میں اس بات کو مزید واضح کیا هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ (23:4) اس کی ترکیب ہے کہ هُم فاعلون کس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ لِلزَّكٰوةِ۔۔۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے کام کرتے ہیں۔ وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے جس سے تمام نوعِ انسانی کو نشوونما کا ساماں ملتا رہے۔ بہرحال آپ باقی آیات سے صرف نظر بھی کر لیں لیکن (22:41) کے مطابق زکوٰۃ صرف اسلامی مملکت دے سکتی ہے۔

ان آیات کریمات کو ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ غور فرمائیں کہ ان ساری آیات کو نظر انداز کر کے ہمارے ہاں ہزار بارہ سو سال سے زکوٰۃ کا نظام صرف ایک روایت پر قائم ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ سونے چاندی کو جمع کرنے کی مذمت میں آیت (9:34) اتری۔ تو صحابہ نے آپس میں چرچا کیا تو حضرت عمرؓ نے کہا لو میں حضور ﷺ سے دریافت کر آتا ہوں۔ اپنی سواری تیز کر کے رسول اللہ ﷺ سے جا ملے اور روایت میں ہے کہ صحابہؓ نے کہا پھر ہم اپنی اولادوں کے لیے کیا چھوڑ جائیں اس میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے پیچھے حضرت ثوبانؓ بھی تھے حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ کے سوال پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی لئے مقرر فرمائی ہے کہ بعد کا مال پاک ہو جائے۔ میراث کے مقرر کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر خوشی کے مارے تکبیریں کہنے لگے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد دوم، صفحہ 306)

مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اس روایت پر تبصرہ کریں ورنہ یہ روایت قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ اسی قسم کی روایات بخاری میں تفصیل سے آئی ہیں۔ ان چند روایات کی بنیاد پر ہمارے ہاں یہ عقیدہ وضع ہوا کہ جس قدر مال و دولت جمع کر لیں اگر اس میں سے اڑھائی فیصدی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو باقی سارا مال پاک ہو جاتا ہے۔

4۔ اسلامی مملکت میں پرسنل اور پبلک لاء کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ اسلامی مملکت جو قوانین و احکام جاری کرتی ہے اس مملکت کا ہر باشندہ اس پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

5۔ اسلامی مملکت میں عبادات اور معاملات الگ الگ نہیں ہوتے۔ قرآنِ کریم کے ہر حکم کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ ہمارے موجودہ فقہ میں بیشتر حصہ میں عبادات کے نام کے احکامات ہوتے ہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ عبادات کے احکام نہیں ہوتے وہ صرف پرستش کی رسوم ہوتی ہیں۔ چونکہ اس مملکت کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہوتی ہے اس لئے پرستش کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہمارے اکثر دانشور مغرب کی تقلید میں یہ کہتے ہیں کہ چرچ اور سٹیٹ کو الگ الگ ہونا چاہئے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں چرچ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اس میں سٹیٹ ہی چرچ بھی ہوتی ہے۔ اس مملکت کی ساری

عدالتیں، تحصیل، تھانے، سب مساجد اللہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہاں سے احکامات خداوندی کا اجراء ہوتا ہے۔

6۔ آج کل اجتہاد پر بھی بہت اصرار کیا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اجتہاد سارے مسائل کا حل ہے اور اجتہاد کو انفرادی کوشش سمجھا جاتا ہے اور پرستش کی رسوم میں اجتہاد کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کے مطابق اجتہاد انفرادی طور پر علماء کرام نہیں کر سکتے اجتہاد اسلامی مملکت کرتی ہے۔ پاکستان ایک زمانہ میں commonwealth کا ممبر تھا لیکن پاکستان نے اپنی خارجہ پالیسی تبدیل کی اور اس طرح commonwealth سے باہر نکل آئے۔ یہ مملکتِ پاکستان کا اجتہاد ہے۔ اگر پاکستان کشمیر کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کرتا ہے تو یہ اجتہاد ہے۔ حکومت پاکستان اگر اپنے Revenue کی شرح میں تبدیلی کرتی ہے تو یہ مملکت پاکستان کا اجتہاد ہے۔

7۔ اسلامی مملکت میں فرقہ بندی حرام ہے اور شرک شمار ہوتی ہے (30:3) فرقہ بندی کرنے کے بعد اس مملکت کا اور اس کے باشندوں کا کوئی تعلق نہ قرآن سے رہتا ہے (3:103) اور نہ رسول اللہ سے (6:159)۔ اسلام میں چونکہ دین و سیاست میں تفریق نہیں ہوتی تو یہی صورت سیاسی پارٹیوں کی بھی ہوگی۔ ان سیاسی پارٹیوں کا کوئی تعلق اللہ و رسولؐ اور قرآن سے نہیں رہتا۔

8۔ اسلامی مملکت میں Sin اور Crime ایک ہی چیز ہوتی ہیں۔ اسلامی حکومت کی نافرمانی Sin اور Crime دونوں ہوتی ہے۔

9۔ سیکولر حکومت اپنے شہریوں کی طبعی ضروریات کا خیال رکھتی ہے لیکن اسلامی مملکت کے قوانین کی اطاعت، نفسِ انسانی کی پرورش بھی کرتی ہے۔ اس مملکت میں جسم اور نفس دونوں کی پرورش ہوتی ہے (2:286) ایسا ضابطۂ حیات صرف قرآن دے سکتا ہے اور یہ اس کا اعجاز ہے۔ کیونکہ جسم اور نفس کے تقاضے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی چونکہ اس مملکت کی اساس مستقل اقدار اور صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے اس لئے اس میں نفسِ انسانی ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ انسان کی طبعی موت کے بعد یہ زندہ رہتی ہے اور اگلی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ جنت بھی اس کی آخری منزل نہیں ہوتی۔ یہ جنت میں بھی اگلی منازل طے کرتی جاتی ہے (66:8)۔

10۔ سیکولر حکومتوں میں حق و باطل کا معیار ووٹوں کی کثرت و قلت ہوتی ہے یہ حکومتیں کسی اخلاق کی پابند نہیں ہوتیں۔ یہ اخلاق کے اپنے پیمانے خود بناتی ہیں۔ مشہور اخبار دی نیوز کی 9 نومبر 2016ء کی اشاعت میں Front Page پر ایک Head Line بطورِ خبر کے پرنٹ ہوئی ہے۔

''Proposal to legalise illegal property in the offing''

یہ خود جائز اور ناجائز کے پیمانے مقرر کرتی ہیں اور حرام کو حلال اور حلال کو حرام خود ہی بنا دیتی ہیں جبکہ اسلامی مملکت میں خود رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ اس مملکت کا کوئی حکم تبدیل کر دیں قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآيِ نَفْسِيٓ ۚ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ ۚ (10:15) ترجمہ: کہہ دو مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے تبدیل کر دوں میں تو صرف اس کی

پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے اس مملکت کے صدر کو یا کسی شخصیت کو استثناء Immunity حاصل نہیں ہوتی۔

ہم نے اس مضمون میں موجودہ فقہ کی چند خامیاں اور غلطیاں تحریر کی ہیں۔ یہ فقہ مُلوکیت ہے، بادشاہوں کے دور کے ہیں اور ان کی اپنی ناک کے نیچے بنایا گیا ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے علماء کرام ان مختلف فقہوں کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ محض ان فقہوں کی وجہ سے ہمارے ہاں فرقے موجود ہیں۔ اگر فقہ پر اس درجہ اصرار نہ ہو تو یہ فرقے فوری طور پر ختم ہو جائیں۔ علامہ اقبال نے پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو خطوط لکھے ہیں ان میں سے ایک خط میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا کہ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ بات کہتے سنا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا کوئی مثل پیدا نہیں ہوسکتا۔ جب آئمہ فقہ کی یہ اہمیت ہے تو فرقے کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔

مضمون طویل ہو گیا ہے لیکن آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت کی بنیاد نفسِ انسانی، مستقل اقدار، صفاتِ خداوندی اور مکافاتِ عمل پر ہوتی ہے۔ جب تک کسی قوم کا ان چار چیزوں پر ایمان نہیں ہوگا اسلامی مملکت قائم نہیں ہوسکتی۔ ایک شخص زہر کھاتا ہے اس کا مکافاتِ عمل یہ ہے کہ وہ فوت ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ چیز ہماری آنکھوں کے سامنے واقع ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات پر یقین و ایمان ہے اور کوئی شخص عموماً زہر نہیں کھائے گا۔ حرام مال کھانے سے نفسِ انسانی پر بُرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایک شخص حرام مال کھاتا ہے اس وقت ترک کرے گا جب اس کو اتنا ہی مضبوط یقین ہو جیسا زہر کھانے سے موت واقع ہونے پر ہے۔ یہ مکافاتِ عمل پر مکمل یقین ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ عالی ہے وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ (45:22) ترجمہ: اللہ نے آسمان و زمین بالحق بنائے تاکہ ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ ملے اور ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ یہ مکافاتِ عمل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا کوئی عمل بغیر نتیجہ پیدا کئے ہوئے نہیں رہ سکتا۔ طبعی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کسان اپنی زراعت کے لئے محنت کرتا ہے اس کا نتیجہ گندم کی شکل میں حاصل ہو جاتا ہے۔ کائنات کے ملائکہ (Physical Force) یہ نتیجہ پیدا کر دیتے ہیں جو ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہی زمین و آسمان کے ملائکہ اقدار کا نتیجہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ انسان کے وہ اعمال جن کا تعلق اقدار سے ہے۔ دھوکہ دہی، فریب، چوری، غیبت الزام تراشی، دوسروں کی حق تلفی اس کے برخلاف لوگوں کی مدد کرنا، ایثار کرنا صدق وصفا، احسان، ان کے جو اثرات نفسِ انسانی پر مرتب ہوتے ہیں، اس میں خارجی کائنات اور ملائکہ کیا Part Play کرتے ہیں اور اثرات مرتب کرنے میں کیا Role ادا کرتے ہیں، ذہن انسانی ابھی یہاں تک نہیں پہنچا۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ملائکہ پر ایمان لانا ہمارا جزو ایمان ہے۔ لیکن جب مغرب کے دانشور اس مکافاتِ عمل پر یقین کریں گے تو پھر اس وقت دنیا کا نقشہ ہی اور ہوگا اور یہ دنیا جنت بن جائے گی۔ یہی چار چیزیں، نفسِ انسانی، مستقل اقدار، صفاتِ خداوندی اور مکافاتِ عمل یہ اسلامی مملکت کے چار ستون ہیں۔ قرآنی فقہ ان ہی چار چیزوں کے گرد گھومتا ہے۔

گردِ آں گردد حریمِ کائنات

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابُ المراسلات

سوال:

ہمارے آس پاس بے شمار مذاہب موجود ہیں اور ہر مذہب حقانیت کا دعویدار ہے۔ انسان جس مذہب کے ماننے والوں میں پیدا ہوتا ہے مرتے دم تک اسی مذہب پہ قائم رہتا ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے پیدائشی مذہب سے دستبردار ہو کر کوئی اور مذہب اپنا لے۔ ایسے میں ہمارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ ہم جس مذہب پر کاربند ہیں وہی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ ہے۔

حقیقت تو ایک ہی ہوتی ہے جس میں تغیر نہیں ہوتا، جو بدلتی نہیں اور جو ہمیشہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اگر ہمارا یقین خدا پر ہے تو پھر ہمارا اس بات پر بھی یقین ہے کہ خدا حقیقتِ کاملہ ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم حقیقتِ کاملہ یعنی خدا کا ادراک کر سکتے ہیں؟

جواب:

آپ کے سوال کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ الحقیقت تک رسائی کیسے ہو سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ الحقیقت (اللہ) کا اگر وجود ہے تو کیا ہے؟

سوال کے پہلے حصہ میں دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ اس وہم میں مبتلا ہوں گے کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں اچھی طرح سے جانتے ہیں اور اس کی حقانیت سے آگاہ ہیں، لیکن یقین کیجئے ایسا نہیں ہے۔ یہ بچپن سے کی گئی برین واشنگ کا اثر ہے کہ ہم رٹی رٹائی باتیں دہرا دیتے ہیں، ان پہ ایک بھی لمحہ کے لئے سوچے بغیر۔ ہم انسان سہل پسند واقع ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا ہو جو ہماری راہنمائی کرے اور بتائے کہ ہمیں کیا کرنا ہے تاکہ ہمیں خود فیصلے کرنے کی کوفت نہ اٹھانی پڑے۔ کیا ہم جانتے ہیں کہ حقیقت کو کیسے جانا جائے؟ کیا کوئی ایسا مذہب ہے جو ہمیں حقیقت سے روشناس کرا دے؟ اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ "حقیقت" ہے کیا اور اس سے کیا مراد ہے؟

جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر آتش باری کرنے والا ایک عظیم اور مہیب گولہ، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، ادھر اُدھر ساحل نا آشنا سمندر اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں، یہاں وہاں کف بردہاں اور سیلاب در آغوش دریاؤں کی خوف سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور

اژدہے، کبھی بادل کی لرزہ خیز گرج، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا ہجوم و اژدہام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سروسامان تنہا ابن آدم۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق اس کا ردّعمل اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ جو بلا سامنے آئے، یہ گڑگڑانا شروع کردے۔ جہاں کوئی خطرہ آنکھ دکھائے یہ اس کے سامنے سرنگوں ہوجائے۔ اس طرح فطرت کی مختلف قوتیں اس کا ''اِلٰہ'' اور یہ اس کا پرستار بن گیا۔ چاند، سورج، ستارے، گرج، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر، حتیٰ کہ وبائی امراض، سب دیوی دیوتا تصور کرلئے گئے اور ان کی بارگاہ میں نذونیاز، منت وسماجت اور مدح وستائش سے اُنہیں خوش رکھنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا (اُس ماحول میں) انسان کا اوّلین ردّعمل۔ خارجی کائنات کے متعلق رفتہ رفتہ اسی ردّعمل نے مذہب کی شکل اختیار کرلی اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ یا تصور مذہب کی شکل اختیار کرلے تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی، چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب کائنات کے متعلق انسان کے اس اوّلین ردّعمل کے مظاہر ہیں۔

کسی ایک مذہب میں دعوؤں کے علاوہ اپنی بات کے حق میں کہنے کیلیے ایک بھی ثبوت نہیں۔ عیسائی سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت آگے کردے گا، کسی ہندو سے پوچھیں تو وہ اپنی کتابیں آگے کردے گا، کسی مسلمان سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت پیش کردے گا۔ سب کی ایک ہی بات کہ ہماری کتاب خدا نے ہدایت کیلیے بھیجی، لیکن خود اس بات کا ثبوت دیکھنے کی ضرورت ندارد۔ سب کی اپنی اپنی تاویلات ہیں جن سے وہ اپنے اپنے خدا کو دعووں کے ذریعے ثابت کرتے ہیں، گویا یہاں بھی کوئی خدائی مداخلت نہیں صرف انسان خود ہے، جو خدا کو منوا رہا ہے۔

اسی طرح مسلمان بھی قرآنی روشنی میں دین سے استفادہ کرنے کی روش کو ترک کرنے اور مذہبی روش اپنانے کی وجہ سے فکری تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوچکے ہیں۔ وہ بھی کثیر الازدواجی کی دلیلیں دیتے ہیں۔ وہ بھی کم عمر نابالغ بچیوں کے نکاح کو عین دینِ فطرت گردانتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ان کے پیغمبر کی سنت ہے۔ دشمن کو رات کے اندھیرے میں گھات لگا کے بغیر کسی پیشگی وارننگ کے قتل کرنا، اور ان کے بچوں کو غلام اور بیویوں کو جنسی تسکین کے سامان کے طور پر رکھ لینے، اور انکی خرید وفروخت میں ان کو کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ صرف عقائد کی بنیاد پر کسی کو حقارت سے دیکھنا ان کے نزدیک عین ایمان بن جاتا ہے۔ جس حقیقت سے وہ خود واقف نہیں ہوتے اس کے لئے جان تک لے لینا (یا دے دینا) ان کے لئے کارِ ثواب بن جاتا ہے۔

کیا ہمیں اپنا تجزیہ نہیں کرنا چاہئے کہ کہیں ہم بھی صحیح غلط کی تمیز سے عاری ہوگئے ہوں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمیں دوسرے مذاہب کے عقائد تو مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں لیکن خود اپنے عقائد میں کوئی عجیب چیز نظر نہیں آتی۔

بہرحال یہاں کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ جس پر چل کر خدا کو مانا جائے اور منوایا جائے۔ حقیقت وصداقت کے راستے معجزات و مذہبی عقائد کی راہنمائی میں طے نہیں کیے جاسکتے، اور نہ ہی کبھی ایسا ممکن ہوا ہے۔ ایسے میں خدا پر یقین رکھنا ایسا ہی

ہوگا جیسے بچے زمانہ طفلی میں سپرمین، سپائیڈرمین وغیرہ کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں۔

اِن مذہبی اعتقادات کے برعکس قرآن ہمیں ہدایت دیتا ہے کہ جو عقیدہ بھی پیش کیا جائے اس کو پرکھیں، اس کا عقلی جائزہ لیں۔ مذہب کیوں شک کی حوصلہ شکنی کرتا ہے؟ کیونکہ مذہب گھڑنے والے جانتے ہیں کہ یہی وہ اوزار ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتا ہے۔ جب آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایمان شک سے بالاتر ہے تو آپ اس پہ شبہ نہیں کرتے۔ جب آپ شبہ نہیں کرتے تو آپ تلاش، تحقیق، جستجو نہیں کرتے اور جب آپ اپنی عقل سے کھوج نہیں لگاتے تو آپ بھٹک جاتے ہیں۔

اِس اعتقادی روش کے برعکس قرآن کا دعوٰی ہے کہ الحقیقت کی فہم کے لئے نہ تو صرف مذہبی اعتقادات سے اور نہ ہی عقل سے رسائی ہوتی ہے، بلکہ دونوں وحی پر ایمان کو عقل و فکر سے پرکھنے کے بعد ممکن ہوتی ہے۔

ایمان کا قرآنی تصور

ایمان کے لغوی معنی ہیں کسی بات کی سچائی کو پورے سکون اور ذہن کے کامل اطمینان کے ساتھ تسلیم کر کے یقین کرنا۔ یہ علم و بصیرت کی بنا پر دلیل اور برہان کی رو سے دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، کسی صداقت کو صحیح تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اقبال کے مخصوص الفاظ میں:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اِس کے برعکس ہم اپنی روزمرہ زبان میں ایمان کا ترجمہ عقیدہ (faith) کرتے ہیں۔ عقیدہ اور عقل و فکر باہمی طور پر ایک دوسرے کے اندر متضاد کیفیات لئے ہوتے ہیں۔ یعنی جہاں عقیدہ ہوگا، اِس میں دلیل و بُرہان (Reason) اور بصیرت کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایمان عقل و بصیرت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کی تائید قرآن سے ہمیں خود رسول ﷺ کی زبانی ملتی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (12:108)

ان سے کہو کہ میری راہ تو بالکل (صاف اور سیدھی) ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی طرف دلائل و برہان کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔

اِس لئے قرآن نے مومنین کی یہ نشانی بھی بتائی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73)

''ان لوگوں (مومنین) کے سامنے جب قرآنی آیات بھی پیش کی جائیں، وہ انہیں اندھے بہرے بن کر اختیار نہیں کرتے''۔

اِس کے برعکس وہ اسوۂ رسول ﷺ کے مطابق غور و فکر اور بصیرت سے کام لیتے ہیں اور اس روش کو اختیار کر کے اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی کرنے والے کہلاتے ہیں۔

جہاں تک سوال کے دوسرے حصہ اللہ کے تصور کا تعلق ہے تو آپ کی بات سے اتفاق ہے کہ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا

کہ اس نے ''حقیقت'' کو پالیا ہے۔ یا یہ کہ وہ ''حقیقت'' تک راہنمائی کرسکتا ہے۔ صرف احمق یا پھر چالباز لوگ ہی ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب حقیقت تک رسائی کا ذریعہ نہیں ہے۔ کیونکہ حقیقت کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں کہ جس تک پہنچا جائے۔ قرآن میں البتہ اللہ کی ذات کا یوں تصور دیا گیا ہے کہ:

قرآن میں اللہ کی ذات کا تصور:

اللہ کی ذات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب عقلِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے۔ عقل در حقیقت نام ہے ان مجموعی نتائج کا جو انسان اپنے علم و مشاہدات سے حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ذرائع جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے، محدود ہیں۔ سو جب وہ ذرائع محدود ہیں، تو ان ذرائع کا ماحصل بھی محدود ہی ہوگا اور محدود، لامحدود کا ادراک کس طرح کرسکتا ہے؟

اسی حقیقت کی طرف قرآن سے بھی وضاحت ملتی ہے کہ:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (6:103)

نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

انسان کا علم محسوسات تک محدود ہے۔ اس کی نگاہیں، غیر محدود و غیر محسوس ذاتِ خداوندی کی حقیقت تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس، علمِ خداوندی تمام نگاہوں کو محیط ہے۔ وہ ایسا لطیف ہے کہ محسوسات کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ہی ایسا خبیر کہ تمام اشیائے کائنات کے احوال و کوائف سے واقف ہے۔ ذاتِ خداوندی کی ماہیت کا علم، انسان کی سرحدِ ادارک سے ماوراء ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم خدا کے عرفان کا نہیں بلکہ ایمان کا تقاضا کرتا ہے۔ جس چیز کو انسان خود براہِ راست نہ سمجھ سکے اس کے متعلق اندازہ لگانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس جیسی کسی دوسری شے پر غور کیا جائے، قرآن کہتا ہے کہ اللہ کی ذات بے مثل و بے نظیر ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ (42:11)

اس کی مثل کوئی شے نہیں۔

لہٰذا اللہ کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے، اللہ نے اپنی ذات کی صفات کا تعارف خود قرآن میں کرایا ہے۔

صفاتِ خداوندی:

اللہ کی جو صفات قرآن میں مذکور ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔

1۔ صفاتِ ذاتی

2۔ اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ

1۔ صفاتِ ذاتی:

یہ صفات ایسی ہیں، جو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ ان میں کوئی اور شریک نہیں ہوسکتا۔ اس میں قرآن

نے چند ایک بنیادی صفات کا ذکر یوں کیا ہے کہ

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (57:3)

وہ (سب سے) پہلے اور آخر اور ظاہر اور مخفی ہے اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی ذات زمان و مکان کی نسبتوں سے ماوراء ہے۔ سب سے اول بھی وہی ہے اور سب سے آخر بھی وہی۔ اس کے لئے نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ وہ ہر شے پر غالب ہے لیکن اس کے قانون کا غلبہ غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے۔ دراصل قانون ہوتا ہی غیر مرئی اور غیر محسوس ہے، لیکن اس کے نتائج محسوس اور مرئی ہوتے ہیں، یا یوں سمجھ لیں کہ جملہ کائنات، اس کی صفتِ خالقیت کی مظہر ہے اور اس کی ہستی کی زندہ شہادت ہے، لیکن اس کی ذات، انسانی نگاہوں سے پنہاں اور مستور ہے۔ اس اعتبار سے وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ الٰہیات کی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا کہ وہ (transcendent) بھی ہے اور (immanent) بھی۔ اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔

2۔ اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط

ان میں ایسی صفاتِ خداوندی کا ذکر کیا گیا ہے جن کو انسانی ذات کی نشوونما ماپنے کا بطور معیارِ مُطلق قرار دیا جاتا ہے۔ اِس معیار کی روشنی میں قرآن نے اِسے اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط کہہ کر بیان کیا ہے کہ

اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط (59:24)

(صفاتِ خداوندی) اپنا پورا پورا توازن (حسن) لئے ذاتِ خداوندی میں مرکوز ہیں۔

خدا کی یہ صفاتِ خداوندی وہ قوتیں ہیں، جو انسان کے اندر بھی خوابیدہ حالت میں موجود ہیں۔

ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ کائنات میں ذات خدا کی ہے اور یا پھر خدا کی طرف سے عطا کردہ انسانی ذات ہے۔ اور یہ بھی کہ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ انہیں مختصر طور پر یہاں دُہرایا جانا مناسب رہے گا۔

انسانی ذات کا اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط سے تعلق:

1۔ خدا کی بھی ایک ذات ہے اور اس کی عطا کردہ انسان کی بھی ایک ذات ہے۔ ذات ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible unity) ہوتی ہے، چاہے وہ خدا کی ذات ہو یا اس کی عطا کردہ انسانی ذات۔

2۔ خدا کی ذات اور خصائص مکمل ترین اور بلند ترین درجہ (اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط) میں جلوہ بار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل انسانی ذات محدود اور سمٹی ہوئی بطور ممکناتِ زندگی کی شکل میں ہوتی ہے، جس کی نشوونما انسانی زندگی کا مقصد ہے۔

3۔ کسی نچلی سطح کی ذات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تکمیل کے لئے کسی بلند ذات کو معیار بنائے۔ اسی لئے خدا کی اعلیٰ صفات کو انسان کے لئے بطور معیار سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اگر اس قسم کا معیار انسان کے سامنے نہ ہو، تو وہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں؟

4۔ خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود اور نشوونما کو زندگی کا نصب العین قرار دینا، خدا پر ایمان کہلاتا ہے۔ یہ ایمان انسان کو حیوانی سطح کی زندگی سے بہت بلند لے جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں، اس کا خدا پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا۔

جس طرح صفات خداوندی اسماء الحسنیٰ ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات میں، خدائی صفات نشوونما پائیں، تو اس کی صفات کے لئے بھی حسنیٰ ہونا نہایت ضروری ہے۔ جب یہ صفات صحیح صحیح تناسب کے ساتھ ایک فرد کی ذات میں منعکس ہوں گی، تو اسے متوازن شخصیت کا حامل قرار دیا جائے گا اور اگر کوئی معاشرہ اس قسم کے افراد پر مبنی ہوگا، تو ان کا معاشرہ بھی متوازن کہلائے گا۔

صفات خداوندی وہ خارجی معیار ہیں، جس کے مطابق دیکھنا چاہیے کہ انسانی ذات کے اندر کن صفات (قوتوں) کی نشوونما کس حد تک ہو رہی ہے؟ ایک غیر تربیت یافتہ انسانی ذات کے لئے ضروری ہے کہ کوئی نشوونما یافتہ ذات بطور خارجی معیار اس کے سامنے رہے۔ اگر انسان کے سامنے اس قسم کا کوئی خارجی معیار نہ ہو، تو وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہے کہ اِس کی نشوونما ہو رہی ہے اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک؟

اہم التماس

جن محترم قارئین طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ دسمبر 2016ء میں ختم ہو چکا ہے ان سے التماس ہے کہ وہ نئے نرخ نامہ کے مطابق، جو کہ اس شمارہ میں شامل ہے، ادارہ کے بینک اکاؤنٹ میں بذریعہ آن لائن یا بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر منتقل کر دیں۔ چیک کی صورت میں اگر بینک لاہور سے باہر کا ہے تو سالانہ زرِ شرکت میں 200 روپے کا اضافہ فرمالیں جو کہ بینک سروس چارجز کے طور پر وصول کرتا ہے۔ ادارہ کے بینک اکاؤنٹ سے متعلق تفصیلی معلومات اندر کے سرورق پر درج ہیں۔ آپ کے اس تعاون سے ادارہ کا یہ واحد آرگن جاری وساری ہے۔ شکریہ

چیئرمین ادارہ

ملتان کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



ملک محمد صفدر ایڈووکیٹ نمبر 54 محمڈن بلاک ضلع کچہری۔ ملتان فون نمبر: 0334-6093266

مطبوعات طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس سے متعلق
ذاتی مشیر، منفرد مفکرِ قرآن و بانی تحریک طلوعِ اسلام اور تحریکِ پاکستان گولڈ میڈلسٹ

علامہ غلام احمد پرویز کی تصنیفات 2017

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)		Out Of Print
(تین جلدوں میں ـــــ فی جلد)		Out Of Print
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)		Out Of Print
(چار جلدوں میں ـــــ فی جلد)		Out Of Print
تبویب القرآن (مجلّد)	1500	1500
مطالب الفرقان (مکمل سیٹ ـــــ سورہ فاتحہ تا سورہ الحجر)	2100	4200
مطالب الفرقان (جلد اول)	300	600
مطالب الفرقان (جلد دوم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد سوم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد ششم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد ہفتم)	300	600
من و یزداں (اللہ کا صحیح تصور)	300	600
اِبلیس و آدم	300	600
جُوئے نور	300	600
برقِ طور (داستانِ حضرت موسیٰؑ)	300	600
شعلۂ مستور (حضرت عیسیٰؑ کی داستان)	300	600
معراجِ انسانیت (سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ)	300	600

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	250	500
انسان نے کیا سوچا؟	300	600
اِسلام کیا ہے؟	250	500
کتاب التقدیر	300	600
جہانِ فردا (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)	300	600
شاہکارِ رسالت (سیرتِ فاروقِ اعظمؓ)	350	700
نظامِ ربوبیت (قرآن کا معاشی نظام)	300	600
تصوف کی حقیقت	300	600
قرآنی قوانین	200	400
سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	250	500
سلیم کے نام خطوط (جلد دوم)	250	500
سلیم کے نام خطوط (جلد سوم)	250	500
طاہرہ کے نام خطوط	250	500
ختمِ نبوت اور تحریکِ ''احمدیت''	150	300
حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (قائدِ اعظمؒ)	*	150
اقبالؒ اور قرآن (اول۔دوم)	300	600
مجلس اقبالؒ۔اول (شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی)	300	600
مجلس اقبالؒ۔دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد...)	*	200
قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان (مجموعۂ مقالات و خطبات)	250	500
بہارِ نو (مجموعۂ مقالات و خطبات)	250	500

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
ISLAM: A Challenge to Religion	300	600
Exposition of the Holy Quran	*	2500
The Book Of Destiny	300	600
Reasons for Decline of Muslims	*	300
Islamic Way of Living	150	300
Letters to Tahira	*	500
Quranic Laws	*	600
The Quranic System of Sustenance	*	600
Did Quaid-e-Azam Want to Make Pakistan a Secular State?	*	200
اسلامی معاشرت (روزمرہ کے متعلق قرآنی احکام وہدایات)	100	200
اسبابِ زوالِ امت	100	200
جہاد (جہاد کے متعلق قرآنِ کریم کے احکامات)	*	150
خدااور سرمایہ دار (مجموعہ مقالات وخطبات)	*	500
سلسبیل (مجموعہ مقالات وخطبات)	250	500
فردوسِ گم گشتہ (مجموعہ مقالات وخطبات)	250	500

متفرق کتب

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مقامِ حدیث	200	400
قرآنی فیصلے (جلد اول)	300	600
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	300	600
قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	*	150
مزاج شناسِ رسول	150	300
تحریکِ پاکستان کے گم گشتہ حقائق	300	*
The Best Of A.S.K. Joommal	*	600
The Pakistan Idea	*	250
Woman - Recreated	*	250
The Bible - Word of God or Word of Man	*	300
The Holy Quran and our Daily Life	*	300

کتابیں ملنے کا پتہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
25 بی، گلبرگ 2، لاہور
فون نمبر: 35753666
trust@toluislam.com
www.toluislam.com

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 01720041073503، حبیب بینک لمیٹڈ، مین مارکیٹ گلبرگ برانچ، لاہور۔

ان قیمتوں میں ڈاک خرچ اور پیکنگ کا خرچہ شامل نہیں۔ یہ قیمتیں کسی بھی وقت تبدیل ہوسکتی ہیں۔

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 3: Spring's Message (*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) –

Message to Fellow-Ambassadors

Episode No. 1

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959)

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

In the lovely garden, spring's magic is in the air;
Birds are singing; what an enthralling atmosphere?
Bring out whatever is hidden in your heart and soul;
Sublime music, sweet song, deep sigh, and loud call!

Dear Brothers, *Assalaamu Alaikum wa Rahmatullah*!

By the Grace of Allah this spring caravan that started gently like the morning breeze about two and half years ago, fearlessly passing through dangerous terrain and terrifying valleys; avoiding sensational attractions and enchanting temptations; undaunted by mighty obstacles; intensely focused; deeply passionate to reach its destination like a spinning cosmic galaxy but devoted to terrestrial green pasture – has, by now, step-by-step, reached a place where the entire atmosphere is echoing with the sounds of the Quranic message, and every individual is saying to the caravan leader:

The days are long past that you were alone in the crowd;
There're now many a confidantes of yours, in the crowd!

My dear friends, you have propagated the Quranic message with so much enthusiasm and with such a deep passion, that in a short time, its effects are being felt in all the corners of the country. The country is buzzing with the Quranic echoes.

Birds' chirping has breathed intense spirit in the garden;
Otherwise, every bud was absorbed in its own daydream!

Changing the dates of the convention

Although the intention for changing the dates of the convention was weather, but it seems that subconsciously, it was also to align with the changes taking place in your world of thoughts and ideas, and with the cosmic forces of nature. The arrival of spring is a call to life from every corner of the world: seemingly dead trees become alive; dead foliage turns into green pasture; new plants sprouting out from rocky barren fields; blooming flowers create colorful tapestry all around. It is as if to announce to the whole world: فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ (30:50) – Behold, then, these signs of Allah's grace - how He gives life to the earth after it had been lifeless! Just contemplate on the effects of Allah's Law of Sustenance, which gives life to earth after it had been lying dead.

Spring rain falling around the tent and swelling the mountains and valleys;
Thousand rapturous melodies arise
Of parrots, francolin, and starling;
All around streams flowing;
Fields full of colorful flowers
Has brought show for the eyes;
Spring rain falling around the tent and swelling the mountains and valleys;
Has brought caravan of flowers and opened the gates of orchards and slope!
Has blown the spring breeze;
Has created new sound of birds;
Has torn the collars of flowers;
Has plucked their fresh beauties;
The love has bought the sorrows;
Has brought caravan of flowers and opened the gates of orchards and slopes!

Desire for new life

My dear friends, it seems the cosmic laws subconsciously influenced you to change the time of the convention and led you to erect your tent in the season of spring so that you can say to your Sustainer: Now that we have seen Thou creation of new life in the external life, our wish is to know the secret to create new life in a dead people. رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (2:260) – Please tell us: "What is the process by which new life may be infused into a dead nation?" O our Sustainer, show us how to create new life into dead hearts? This is the center of our circle of wish for which we have gather here together; and this is the question for whose answer we have spread our begging bowl to our Sustainer who has proclaimed openly: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186) – when anyone calls upon Me to lead him to the right path, My Guidance which is preserved in the Quran, answers his call. But to get the reply from His guidance, certain prerequisites are required: (1) One needs to have true and sincere desire in one's call; (2) one needs to have deep passion and intensity in his wish; and (3) one needs to have the mental ability to understand His guidance. When the seeker wants to seek answers after having achieved these prerequisites, then this Book welcomes him with its open arms.

The Sunrays are themselves longing with inner desire to launch;
Otherwise, the reality of the flight of dewdrop is too well known!

Fortunate are those nations, who, along with deriving material benefits from

the external universe also search for the welfare of their inner world, the world of heart and soul: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (13:29) – Those who believe and wish to have a heart free of worry, tell them that this can only be achieved by keeping Allah's laws constantly in mind. Those who believe in Allah in such a manner and act righteously shall have blessings of all kinds and shall live a most beautiful and balanced life.

***

Revolution and martial law

After we met last time, in October 1957, there has been a change in the world of thoughts and ideas; but even more important, there has been a change in the external world, i.e., in the state of Pakistan. Those who have only a simplistic view of the political chessboard may not fully appreciate the real significance of this change. But those with ability to go beneath the surface know that behind this change is the working of the cosmic forces of nature. These are the forces which are normally referred to as the demand of the time. And, the demand of the time is saying loud and clear that:

The old game of political craftsmanship is debasing;
The earth is fed up with rule of Sultan and despots;
Capitalism's reign of horror is past; its age is gone;
The magician has shown his magic show, and gone!

The world knew this but we were sleeping cozily under the blanket woven by warp and woof of capitalism and priesthood. If we had continued any further then the flood of communism would have landed with its full fury, and would have swept all our values and ideologies like straws and hays. But, before this flood could land, we pushed aside the political and selfish forces of capitalism by the wayside; and started instituting land reform.

Land reform

As far as land ownership according to the Quran is concerned, there is considerable literature available on this issue from Tulu-e-Islam. Therefore, there is no need to go into details here. As you know, there is no question of individual or collective ownership of land in Islam. The concept that the Quran has given about its economic system is this:

1. The Earth is the source of sustenance for all humankind.
2. It is the duty and responsibility of the Islamic government to provide the basic needs of life to all human beings. That is, the Islamic government cannot just say that it will *try* to fulfil this promise but that it *must deliver* on this promise. This duty *must* be the justificatory reason for its existence. The Quran openly and clearly proclaims: الَّذِينَ

(22:41) – If We bestow on them the authority to rule and they do come into power, they will establish the order Salah (so that everyone in society follows the system of Divine Laws). They will provide means of development to each and every one and enforce Laws which are in conformity with the Divine Code (the Quran); and forbid people from doing anything that is contrary to it. In other words, in every case they will first look for the guidance given by Allah's Law; and then after discussion and consultation decide their affairs according to the Divine Law.

3. It is clear that Islamic government cannot fulfil this responsibility unless the sources of sustenance are within its control.
4. Therefore, according to the Quran, the land and other sources of production must necessarily remain under the control of the government. But, contrary to this Quran's clear guideline, our Sharia – developed by our religious priesthood under the auspices of kings and autocratic dictators – says that private ownership of land is allowed without any limits; and that the government does not have any right to impose any restrictions on private ownership of land, let alone declare it illegal. But, it is heartening to note that the report of the land reform commission, set up by the martial law government, recognizes that there cannot be private ownership of land.

Land reform commission's report

It says that, from the point of view of the landlords, putting any limitation on the ownership of land is extraordinary event. They think that doing this is equivalent to communism and therefore against Islam. In saying this they do not take into account that there are four Islamic countries – Egypt, Syria, Iraq, and Turkey – that have placed limitation on land ownership. They say that why single out land and not put limitation on ownership of other kinds of wealth such as ownership of industries and factories. [Report pp.25-26]

Well, my friends, you are not unaware that this kind argument is not the product of the mind of the landlord. This has been handed to them by our custodians of religion [Maududi, *The issue of Land Ownership*]. Anyway, this was a side issue. The report continues:

The landlord must always remember that the any ownership of land is not absolute. [Page 26]

To clarify this point the report continues regarding "compensation for the land":

> On the issue of the ownership of the land we mentioned that private ownership of the land cannot be full and absolute because the government has the right of taxation. Theoretically, the government could increase the tax so much that there is nothing left for the owner. Therefore, if the government does not give anything in return for it acquiring the land from the private owner then it cannot be held against the basic concept of ownership of the land in light of the above argument. [Page 43]

Do you see my friends, how the commission's research conclusion is closer to the basic concept of the Quran regarding land ownership. History tells us that during the period of Caliph Umar (R) the government acquired land without paying any compensation to the owner. Also, anyone who accepted Islam, his land automatically went under the control of the government. From this you can see that the land reform commission's decision limiting private ownership of land is a bold step in the direction of Quran's economic system.

The size of land area

> The limit on the size of land area that has been recommended for private ownership by the land reform commission is too large according to some, including one of its members. In this regard, the commissioners say that we have taken various factors into account in setting this limit, not the least being that a drastic reduction might cause undue hardship to some. [Page 29]

From this it is clear that the government wants to reach its goal slowly and gradually. That is:

It is not that there is any shortage of tears;
It is just to be kind to the size of the sleeve!

From this it could be hoped that if the government keeps moving in this direction, then, step by step, it will reach the Quran's goal: that not only the land but all other sources sustenance eventually must come under the control of the Islamic government, which, then, becomes responsible for meeting all the basic needs of the people. This is called the system of universal sustenance which is the realization of Allah's attribute (within human limitation) of being the Sustainer of all the worlds: رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1). And those who carry this out, proclaim to the whole world: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (2:138) – We have acquired color (harmony) with the Divine Laws. Say: "This is the best way and this is the way we have chosen for ourselves."

Humanity's salvation and wellbeing

Did you notice, my friends, how Allah's cosmic forces have been taking the

world in the right direction. The reality is that the road for humanity's salvation and wellbeing cannot be but the one given by the Quran as determined by its permanent values. The world can try other roads as best as it could, but, after all its failed experiments, it will have to eventually come to the road which the Quran has prescribed, and on which the footsteps of that most sublime and greatest personality (PBUH) are resplendent like shining stars; and, who, by walking on that road, carried the humanity to its destination – humankind's ultimate dignity. History bears testimony to the fact that the direction of every humanistic revolution that happened in the last 1400 years was in that direction; and that every right revolution that will happen in future will also point in that same direction that was shown by the Prophet (PBUH):

Vision's light, mind's stars, mark of aching heart;
Wherever light is, it has come from the same source!

Mullahs and Sufis

But whereas this reality is enormously glad tiding to humanity, that after every failed experiment it has always come to the goal as determined by the Quran, it is also quite strange and extremely painful to observe that the greatest opposition and the biggest hindrance to the Quran has come from our own religious establishment.

What a revolution took hold of a town;
Drunkards are awake; pious ones asleep!

But this is nothing new. The Quran has warned Muslims is clear-cut words: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (9:34) – O People who believe! A good many of the Sufis and Mullahs devour others' property and turn them away from Allah's path. Human history as well as the past history of Islam is witness that nonbelievers and agnostics have not been as successful in turning people away from Allah's path as much as those who claim to invite people to His path but in fact they are the biggest hindrance in its way.

Falsehood in the garb of truth

The reason is obvious. If falsehood comes out in its true color then it will never succeed. It is necessary that it should come in the garb of truth in order to succeed: A person comes to you and tries to convince you to do something. You are convinced; and you promise to do it. But just before leaving he tells you that whatever he said was false. Tell me, would you keep the promise you made to him? You won't. The only way you will do it if until the end he keeps insisting and swearing that whatever he said was true. It is clear from this that

for falsehood to succeed it must appear in the garb of truth. This is precisely the reason that those who want to prevent you from following the path of Allah come to you wearing the garb of facilitating the path of Allah. This is the only way they can succeed in their mission of falsehood – to come to you wearing the garb of truth. This is the reality which the Quran has pointed out about these people's technique in misleading people: فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (2:79) – These people practice deception not only on others but also amongst themselves. The illiterate ones amongst them do not know what Allah has revealed and refer their questions about the Sharia to their religious leaders. The latter frame the Laws of the Sharia themselves but tell the former that these Laws are Divine. Thus they deceive others just to secure a paltry price for it, not realizing that their fabrication of the Sharia and their use of it as a means of livelihood will bring about their ruin.

If they said that the Sharia they have concocted is from their own and is not the order of Allah, then no one will be fooled by their deception. The very reason their deception succeeds is that they call their own decisions as Allah's order.

It is difficult for other nations to find out whether what their religious leaders say is true or false because they do not have their original divine books with them anymore. But our situation is different from them. We have Allah's Book exactly in its original form word for word and everyone has access to it.

It is fortunate that the door of the tavern is still open!

All we have to do is to take everything that is presented in the name of دین (*Deen*) and test it against this Book, and see whether it is really from Allah or whether it has been falsely attributed to Him.

The remedy is that love seeks freedom;
I prostrate before Him and seek wisdom!

Repeal of the current constitution

My dear friends, the first good thing we saw of the martial law was in terms of the land reform. The second important thing was to repeal the constitution which was, by and large non-Islamic; but our religious establishment had given fatwa that it was Islamic. We very much wanted that, without delay, the 1956 constitution be changed into Quranic constitution. But our only way was to do it through democratic and constitutional means; and all our efforts were directed in that direction. We were fully cognizant of the fact that this was a very slow process and the time was running fast. Many friends started saying to me that with this extremely slow approach how and when we will be able to

reach our destination?

The intention is going to take a long time to have any effect;
But who is going to live that long in order to see any effect?

I used to say to them that I fully realize your impatience but you should keep an eye on the value of patience in seeking your passion. But I could sense that this did not satisfy them. And thus hopelessness used to set even in those hearts who knew that hopelessness is unbelief. Under these conditions martial law came and with one stroke of pen declared the constitution null and void.

Love's one giant leap ended the whole story;
I thought the earth and heavens were limitless!

Construction after destruction

But this destruction is only one part of the process. And it is obvious that if construction does not follow destruction then the change, instead of being better, it becomes harmful. This is why the Quran says: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (2:256) – Whoever turns away from the wrong path of oppressive forces and comes to the right one has grasped the most trustworthy hand-hold which will never break. As Allama Iqbal says:

The destruction of the old opens the door for slow construction;
Illa (الا) did not have any that remain in the abyss of the La (لا)!

If you see from this point of view then we are standing at the place we were standing in 1947. That is, we have an independent state for which we have to create a constitution. The question is: What kind of constitution that should be? We, at Tulu-e-Islam tried continuously within our means until 1948, to explain to the nation: What was that ideology for whose practical implementation this land of Pakistan was acquired; and what is the constitution of an Islamic state? Although our effort to propagate the Quranic message surpassed our expectation; but the tactics of the status quo and selfish sections of our society were more effective in thwarting the practical implementation of the Quranic – hence Islamic – constitution in the state. It seems, on the Nature's scale of accountability, our destruction was not eternal. Therefore, we were given a second chance to redress for our past mistakes. Otherwise, it is the law:

That Nature overlooks the sins of individuals;
But it does not forgive the crimes of nations!

The question of framing a new constitution

But look at bad luck of the country? The moment the question of framing a new constitution arose, the same old forces of destruction that were busy for 9 years before in their "great Jihad" in making sure that this country's constitution

never becomes truly Islamic, raised their ugly heads to make sure, once again, that the new constitution does not become Islamic; that it does not reflect Quran's permanent values – no matter even if Islam becomes a laughing stock in front of the whole world; no matter the Islamic ideology becomes maligned in the world and appears as deceptive.

I want the dome of the proper setting destroyed;
Although, with it, I also fall and get destroyed!

Now, this debate about what is an "Islamic constitution" is being started anew and muddled. New questions are being raised about what are the distinguishing features of an Islamic state? Or that: Can an Islamic constitution be created in Pakistan, etc.? As I mentioned, I have written in detail about these topics in the past 10 years and there is neither need nor the time to go into them here. I think at this time it would be enough that I present to you briefly the core concepts of an Islamic state.

The difference between secular and Quranic state

The first question is: what is the difference between a secular state and the Quran's divine state? If one wants to go into details then it will be too long and too much to cover. But if we want to understand the principled difference between them then it could be explained in few words. The goal of a secular state is to protect interests of the nation and its people; and to achieve this goal *any* means that can be used are not just considered right but necessary. In other words, the principle – if it can be called a principle – is opportunistic expediency. It is not hidden from political thinkers that the leader of this political philosophy is the famous Italian intellectual Niccolò Machiavelli. He is the author the universally famous book, *The Prince*. The summery of the ideology that he advocates in this book is this:

Every tactic that leads to increased power of the state needs to be appreciated; and every deception that leads to success is worthy of praise and reverence. Justice is another word for power. One who has power has the right to own. This is the law of nature. Whether in peace or in war, the most effective weapon of the state is power and deception. The best characteristic a ruler must possess is cunningness like fox so that he could spread a web of deceit. He must display raw force so that he could terrorize wolves. He may not possess any virtue but appear to be greatly virtuous. It is okay if a virtue does appear in his heart but he should discard it right away without any hesitation and act against that virtue when time for any opportunistic expediency arises.

This is the bible of modern political philosophy about which Lord Grey said

that problems of states are not decided based on moral values.

And Lord Walpole said that a virtuous man cannot save an empire. This is because the length that one has to go to save an empire the virtuous person cannot go.

This is the politics about which morality is divided into two parts: one set of values for private morality and another set for public morality in political arena. The difference between the two is described by the famous Italian politician Cavour as: If we do in private what we do in public then we will be called great devils.

According to this measure the greatest devil is considered to be the "greatest patriot" and the state erects his statue and generations call him heroes.

This, my dear friends, is the basic concept of secular state. In contrast to this, the concept of divine state is that there are certain values of human life that are permanent and inviolable. These cannot be altered under any circumstances. In secular state the sovereignty belongs to majority; which means their representatives can make whichever laws they prefer by a majority vote. But in the Quranic state even 100% of the people cannot make any changes in the permanent values. The very existence of the Quranic state is to protect and preserve the permanent values. And these values are clearly described in the Quran. Islamic government is one which declares its goal as the realization of these permanent values in real life of its society. The constitution that will guarantee and protect these values will be called the Islamic constitution. These permanent values specify the boundary lines within which the Islamic government can create laws depending on the circumstances of a particular time and place. The principles will remain fixed and unchangeable but these laws may change. Islamic society is the reflection of this beautiful symbiotic combination of permanence and change like a tall tree whose roots are deep and firmly fixed in their place and whose branches reach the sky and are free to grow whichever way they wish: كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ (14:24). Or like the bird which:

Flies higher in the wide expanse of the skies;
But keeps always focused on its home, its eyes.

This foundational principle of divine state is like the center of a circle; where if one leg of the compass is firmly fixed at the center then the other leg keeps on creating perfect bigger and bigger circles by extending itself. If the leg on the center wavers even slightly then the circle gets crooked. To Be Continued....

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 70
ISSUE
1

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

لَوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب!
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقلِ غیاب و جستجو! عشقِ حضور و اضطراب

(علامہ اقبالؒ)